صفا



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

شمارہ ۳ ؛ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۸ء ؛ م صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

مدیر اعلیٰ
محمد رضوان القاسمی

مدیر
خالد سیف اللہ رحمانی

سالانہ زرِ تعاون ۴۰/- روپے — معاون خصوصی ۱۰۰/- روپے ؛ فی پرچہ ۱۰/- روپے

ناشر
شعبۂ نشر و اشاعت دار العلوم سبیل السلام، بارکس، پوسٹ بالاپور حیدرآباد ۵۰۰۰۰۵ انڈیا
فون نمبر ۲۳۹۴۵۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

"۱۴۰۹ھ" کا سال جہاں اپنے دامن میں عالمِ اسلام کے لئے بعض نوید ہائے جانفزا لایا ہے وہیں بعض ایسے حادثات بھی، جو یقیناً دور رس اثر کے حامل ہیں ——— ان حادثات میں سب سے اہم "شہید جنرل محمد ضیاء الحق صدر مملکت پاکستان" کا سانحۂ شہادت ہے۔ شہید مرحوم ہندوستان کے شہر جالندھر میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے، دہلی اور کوئٹہ میں تعلیم حاصل کی، اپنی لیاقت اور صلاحیت کی وجہ سے جونیئر ہونے کے باوجود بعض سینیئر کمانڈروں پر ترجیح دیتے ہوئے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے ان کو پاکستان کا "سپہ سالارِ اعظم" مقرر کیا، پھر ۱۹۷۷ء میں جب مسٹر بھٹو کی آمریت اور جبر و استبداد حد سے گذر گیا، اور ان کی غیر اسلامی فکر کی وجہ سے پاکستان اپنے مقصدِ وجود، یعنی اسلام کے نفاذ سے دور ہوتا چلا گیا، ان حالات میں ایک مردِ غیب کی صورت میں شہید مرحوم منظرِ عام پر آئے اور مسٹر بھٹو کو معزول کر کے زمامِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لی۔

شہید مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی جد وجہد اور اس کے لئے انتھک سعی و کاوش ہے۔ انہوں نے پاکستان میں اسلامی حدود و تعزیرات نافذ کیں، پردہ و حجاب کا نظام نافذ کرنے کی سعی کی، زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا، شرعی بنچ اور عدالتیں قائم کیں اور نہایت حکمت و تدبر کے ساتھ بتدریج قانونِ اسلامی کی تنفیذ کی جد وجہد جاری رکھی ——— اس کے ساتھ انہوں نے افغانستان میں روسی استبداد کا پوری پامردی اور جرأت و استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس کی ہزار دھمکیوں کے باوجود کمیونزم کو کسی طرح اپنے دروازے تک پہونچنے کی اجازت نہ دی، یہاں تک کہ بالآخر روس کو افغانستان کے تخلیہ کا فیصلہ کرنا پڑا، اگر اس زمانہ میں پاکستان کو شہید مرحوم جیسا مردِ مومن اور فرلیس و مدبر سیاستداں فرماں روا میسر نہ ہوتا تو بظاہر اس فتنہ سے نمٹنا آسان نہ تھا۔

وہ پاکستان کی تاریخ میں اب تک کے سب سے طویل المیعاد سربراہ تھے اور برصغیر کے نہایت قدآور

اور بلند قامت سیاست دانوں میں ان کا شمار تھا۔ فوجی ہونے کے باوجود قدرت سے بلا کی فراست، قوتِ فیصلہ اور تدبر ان کو عطا ہوا تھا، عالمِ اسلام میں شاہ فیصل شہید کے بعد شاید ان جیسا کوئی غیور اور مخلص و بے داغ حکمراں پیدا نہیں ہوا، گیارہ سال کے طویل عہد حکومت کے باوجود کسی کو ان کی نجی زندگی اور ذاتی حالات پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا، اور نہ ان کے خلاف کوئی اسکینڈل سامنے آیا، ان کے خاندان اور گھر والے آج بھی اپنے معمولی مکانات میں گذر بسر کرتے ہیں، عبادات کے پابند تھے، تلاوتِ قرآن مجید کا ایسا معمول تھا کہ اس سفر آخرت میں بھی مصحف قرآنی ساتھ تھا، فوجی زندگی میں بھی "جنرل تقوی" کے نام سے معروف تھے۔

ہندوستان سے تعلقات کی خوشگواری کے لئے بھی انہوں نے بہت کام کیا، پانچ بار ہندوستان کا سفر کیا، موت سے پہلے ہندوستان کے ایک معزز لیڈر مرارجی ڈیسائی کو پاکستان کا اعلیٰ ترین اعزاز "نشانِ پاکستان" عطا کیا۔ ہندوستانی صحافی، ادیب، اسپورٹس مین اور ثقافتی وفود سے فراخدلانہ ملاقاتوں کا موقع دیا اور ان سے جو بھی ملا ان کی شرافت، انسانیت اور محبت کا نقش ساتھ لے کر آیا ——— وہ جہاں بہتوں کے محبوب تھے اور نہ جانے کتنے اہل دل کی دعائیں ان کے ساتھ تھیں، وہیں ان لوگوں کی تعداد بھی کم نہ تھی جن کے دل میں ان کا وجود ایک کانٹا بنا ہوا تھا، یہ لوگ گو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، تاہم "اسلام بیزاری" ان کے درمیان قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے، عجب نہیں کہ ان کے حادثۂ رحلت میں ان کے دشمنوں کا بھی ہاتھ ہو اب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو اس سمتِ سفر پر قائم رکھے، جو صدر شہید مرحوم نے اس کے لئے متعین کیا تھا اور عالمِ اسلام کو ان کا بہتر بدل عطا فرمائے۔

اس وقت عالمِ اسلام کے لیے سب سے زیادہ مژدۂ جانفزا "ایران وعراق" کی طویل المیعاد جنگ کا خاتمہ ہے، یہ بدبختانہ جنگ جو آٹھ سال سے زیادہ عرصہ سے جاری تھی اور جس نے عالمِ اسلام کی بہترین قوت صلاحیت اور وسائل واسباب کو ایک بے مقصد لڑائی میں بری طرح پامال کر کے رکھ دیا تھا، خدا خدا کر کے اس وقت ختم ہوئی جب ایران نے اقوامِ متحدہ کی جنگ بندی تجویز کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا۔ یہ اقدام ایران نے اس وقت کیا ہے جب بین الاقوامی برادری سے کٹ جانے کے علاوہ عسکری طور پر اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں رہ گیا تھا، اور ایران اس بات پر مجبور ہو گیا تھا کہ ملک کے نوجوان طلباء کو بھی محاذِ جنگ پر جھونک دے۔ خمینی صاحب نے جنگ بندی قبول کرنے کو زہر کا پیالہ پینے کے مرادف قرار دیا، اور آخر کار

"بعد از خرابیٔ بسیار" اس پیالہ کو حلق سے اتارا ـــــ کاش! ایران نے اپنے رویہ میں یہ لچک پہلے ہی قبول کرلی ہوتی تو نہ صرف اس کے وقار میں اضافہ ہوتا، بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی یہ جنگ بندی اس کے مفاد میں ہوتی۔

گذشتہ چند سالوں سے ایرانی حجاج کے مظاہروں کی وجہ سے حج کے موقع سے بھی زبردست نقضِ امن کا خطرہ رہا کرتا تھا، گذشتہ سال سعودی سپاہیوں کے تحمل کے باوجود ایران کے تربیت یافتہ مظاہرین کے رویے نے بہت سے زائرینِ حرم کی جان لے لی، اس سال بجا طور پر سعودی حکومت نے حجاج کی تعداد پر تحدید عائد کی، اس کے جواب میں ایران نے حج کا بائیکاٹ کیا، جو ظاہر ہے ایک بدبختانہ عمل تھا، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس مقاطعہ کی وجہ سے حج امن وسکون کے ساتھ ہوسکا اور نقضِ امن کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، ایک طرف دعوتِ اتحاد اور دوسری طرف اس طرح کی تدبیر تفریق وانتشار، حد درجہ افسوسناک ہے۔

اس سال کے حوادث میں ایک اہم حادثہ نیپال کی ترائی سے دہلی تک پورے شمالی ہند میں محسوس کیا جانے والا زلزلہ تھا، جس نے خصوصیت سے نیپال کے بعض علاقوں کے علاقے، صوبہ بہار میں دربھنگہ، مدھوبنی، اور مونگیر میں سخت تباہی کا باعث بنا۔ یہ زلزلہ گو ۱۹۳۴ء کے زلزلہ کے مقابلہ میں بہت ہلکا تھا، تاہم چونکہ رات کے آخری پہر ۵ بجکر ۴۳ منٹ پر آیا، اسلئے سیکڑوں جانیں اس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئیں، ہزاروں افراد شدید زخمی ہوئے اور بے شمار مکانات گرگئے۔ دربھنگہ کے معروف اور قدیم مدرسہ، مدرسہ حمیدیہ کی پُرشکوہ عمارت پوری کی پوری زمین بوس ہوگئی، جس کے نتیجے میں مدرسہ کے صدر مدرس اور ان کے صاحبزادے اور متعدد طلباء شہید ہوگئے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اس طرح کے واقعات جغرافیائی اسباب کے تحت پیش آتے ہیں اور اس کی طبعی اور ارضیاتی وجوہ ہیں، لیکن اہلِ ایمان کا یقین ہے کہ دنیا میں جو بھی واقعات پیش آتے ہیں ان کی اصل صرف یہ ظاہری اسباب وعوامل نہیں ہیں، بلکہ اس کے پیچھے خدا کی قدرت ومشیت کارفرما ہے اور اس کے دستِ اعجاز اور کلمۂ "کن" سے نظامِ فطرت میں ہر طرح کا تغیر رونما ہوتا ہے۔ سورج گہن اور چاند گہن بھی ایک فطری واقعہ ہے، لیکن اسلام نے اس کو بھی مسلمانوں کے لئے مایۂ عبرت بنادیا ہے کہ قدرت کی اتنی بڑی اور روشن نشانیوں کے بظاہر روشنی سے محروم ہوجانا انسان کو خدا کی قدرت بے نہایت اور اس کے مقابلہ انسان کے

عجز و بے چارگی پر متنبہ کرتا ہے، اسلئے اسلام نے اس موقعہ سے "خسوف" اور "کسوف" کی نماز رکھی۔

زلزلہ خدا کی بے پناہ قدرت کا مظہر ہے، زلزلہ قیامت قائم ہونے سے پہلے قیامت کی ایک ادنیٰ جھلک ہے۔ زلزلہ ربِ کائنات کی طرف سے بندگانِ خدا کے نام کھلی تنبیہ ہے اور زلزلہ دنیا اور اسبابِ دنیا کی بے ثباتی کا روشن نشان ہے ——— ایک طرف ملک و ملت کا دینی اور انسانی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ان پریشان حال اور خانماں برباد بھائیوں کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھائیں۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ اس غیر معمولی واقعہ سے عبرت حاصل کی جائے، اپنی عملی زندگی پر توجہ کی جائے، انابت الی اللہ پیدا ہو اور آخرت سے پہلے انسان خود کو آخرت میں تصور کرنے لگے ——— اس قدرتی حادثہ کے نتیجہ میں جو تباہی آئی ہے وہ بہت زیادہ ہے، پریشان حالوں اور مصیبت زدوں کی امداد کے لئے دیگر اداروں کے علاوہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ نہایت نمایاں کام کر رہی ہے، حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ نے اہلِ خیر حضرات سے فراخ دلانہ تعاون کی اپیل کی ہے، جس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ابھی "صفا" کا یہ تیسرا شمارہ ہی ہے، لیکن علمی اور ادبی حلقوں میں اس کو جو قبول حاصل ہوا ہے "صفا" کے خدام کے لئے صد درجہ حوصلہ افزا ہے، ہم کوشاں ہیں کہ نہ صرف اس کے علمی معیار کو برقرار رکھا جائے، بلکہ اس کو اور اونچا اٹھایا جائے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جائے، جدید اور عصری مسائل پر روشنی ڈالی جائے، ادبی ذوق کی بھی رعایت ہو اور ایسے دعوتی اور تذکیری مضامین بھی شریکِ اشاعت کئے جائیں، جو عام فہم اور ہر طبقہ کے لئے قابلِ استفادہ ہوں۔

زیرِ نظر شمارہ میں قرآنی احکام سے متعلق ایک اہم موضوع "ایصالِ ثواب" کے مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے، جس میں احادیث کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ کن اعمال کے ذریعہ ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، قرآن و حدیث میں باہم انطباق پیدا کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں مروج بعض غیر شرعی امور کو فقہ کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے جدید حل طلب اور غور طلب فقہی مسائل میں ایک "اعضاء کی پیوند کاری" کا مسئلہ ہے، اس موضوع پر اردو عربی میں متعدد لوگوں نے مثبت اور منفی تحریریں لکھی ہیں، اس موضوع پر جو تحریر اس شمارہ میں شریک کی گئی ہے، میرا خیال ہے کہ وہ نہ صرف اس میں ایک وقیع اضافہ ہے، بلکہ شاید اب تک کی اردو تحریروں میں سب سے زیادہ مدلل بھی ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق بھی۔ دوسرا فقہی مضمون "اسلام کا قانونِ نکاح" ہے جس میں دفعہ وار

اسلامی قانون کو پیش کیا گیا ہے، متن قانون فقہ حنفی کے مطابق ہے، شرح قانون میں ائمۂ اربعہ کے مسلک کو واضح کر دیا گیا ہے، ہر بات حوالے کے ساتھ لکھی گئی ہے اور حاشیہ میں حوالہ کی عبارتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔

اسلامی شخصیات میں "ابن تیمیہ" پر اور اسلام کے سیاسی نظام میں "اقلیت کے ساتھ سلوک" کے اہم موضوع پر ایک بیش قیمت مقالہ شریکِ اشاعت ہے، جس میں اسلام کے خلاف اٹھائے جانے والے بعض اعتراضات کے جواب بھی دئے گئے ہیں، ادبیات میں بعض نظموں کے علاوہ تذکروں کی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی اہمیت کے موضوع پر ایک معلومات افزا تحریر بھی قارئین اس میں دیکھ پائیں گے، اس شمارہ میں شائع ہونے والے سوال و جواب بھی بڑے اہم ہیں اور یقین ہے کہ توجہ کے ساتھ پڑھے جائیں گے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تذکیری اور معلوماتی مضامین ہیں جو اس شمارہ کی زینت ہیں۔ آئندہ شمارہ سے ارادہ ہے کہ چند ان اہم اور تاریخی اسلامی کتابوں کا تعارف قارئین کی معلومات کے لئے پیش کئے جائیں، جنھوں نے اسلامی علوم پر اپنا گہرا اور دیرپا نقش چھوڑا ہے ———— ہم رسالہ کی صوری اور معنوی پرکاری اور تزئین کے لئے اپنے قارئین کے گرانقدر مشوروں کے منتظر رہیں گے، کہ آپ کے مخلصانہ اور قیمتی مشورے ہی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

علمی اور تحقیقی کام، سنگلاخ وادی کا سفر کرنے کے مرادف ہے، اردو صحافت کا حال یہ ہے کہ سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی کہانیاں، محبوب کے زلف و عارض کو بے پردہ کرنے والی غزلیں، ہیجان انگیز تصویروں سے آراستہ فلمی رسائل اور جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ صحافت کے نمائندہ اخبار و جرائد کے لئے تو اردو داں اور اردو خواں حلقوں میں خوب جگہ ہے، لیکن تعمیری ادبی رسائل، علمی سائنسی مجلات، اور ٹھوس فکری، معلوماتی اور اسلامی رسالوں کے لئے ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں اور ان کے لئے اپنے وجود کو باقی رکھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں جو لوگ گہرے علمی اور فکری رسائل کی امانت امت تک پہونچانے کی سعی کریں، وہ یقیناً ہر طرح شکر و امتنان کے حقدار اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ "صفا" کے اجراء کا مقصد بھی یہی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اسی جذبۂ و احساس کے تحت بہار کے مردم خیز اور علم و ادب سے عطر بیز اور مشک ریز سرزمین سے بھی ———————— ایک خالص

علمی اور فقہی رسالہ "بحث و نظر" کے نام سے نکلا ہے، اب تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں، اور اس طرح وہ "صفا" کا ہم عمر اور ہم سن بھی ہے۔ خالص علمی اور تحقیقی ہونے کے لحاظ سے میرے علم کے مطابق اس وقت وہ برصغیر ہند و پاک کا اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے اور مشہور عالم دین اور فقہ اسلامی کے ماہر قاضی شریعت بہار و اڑیسہ حضرت مولانا **مجاہد الاسلام القاسمی** کے زیر ادارت نکل رہا ہے کہ یقیناً وہی اس نوعیت کا رسالہ نکالنے کے مستحق بھی ہیں۔

دار العلوم سبیل السلام اور ادارہ "صفا" رسالہ کے ذمہ داروں کو اس مسعود اقدام پر مبارکباد دیتا ہے اور دعا گو ہے کہ اس کو بقاء و دوام اور قبول و استحکام حاصل ہو۔ واللہ المستعان۔

نوٹ: افسوس کہ افتتاحیہ میں جن مقالات کا ذکر کیا گیا تھا، ان میں سے بعض عدم گنجائش کی وجہ سے شریک اشاعت نہ ہو سکے، البتہ بعض دیگر مضامین جو بعد میں آئے اور جن کو اس شمارہ میں شریک کیا جانا مناسب محسوس ہوا وہ شریک کر دئے گئے ہیں، انشاء اللہ بقیہ مضامین آئندہ شمارہ میں شائع ہوں گے۔ (م۔ ر)

محمد رضوان القاسمی

۱۱؍صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

۲۳؍ستمبر ۱۹۸۸ء روز جمعہ

احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں

مستشرقین کی افتراپردازیوں کا جائزہ۔

مولانا ابد ا الحسن القاسمی (کویت)

قرآن حکیم کی طرح مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذخیرہ کو بھی اپنی نکتہ چینی نشانہ بنایا ہے، اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت چونکہ اسلامی قانون کے دوسرے اہم اور بنیادی مآخذ کی ہے، اس لئے انہوں نے اس پر مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں مستشرقین کے پیدا کردہ شبہات و اوہام کا حاصل یہ ہے کہ:۔

(۱) سنت یا حدیث TRADITION ان تمام اقوال و افعال عادتوں اور رسم و رواج کے مجموعہ کا نام ہے جو مسلمانوں کو قرنِ اوّل سے ورثہ میں ملا ہے۔[1]

(۲) ہزاروں احادیث مسلمان علماء نے گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی ہیں، اور چونکہ تدوینِ حدیث کا کام حضورؐ کے زمانہ میں نہیں ہوا تھا، اسلئے حدیث کی تمام کتابوں میں بہت بڑی تعداد میں موضوع روایتیں جمع ہو گئی ہیں۔[2]

(۳) تمام موضوع روایتیں بعد کے زمانہ کی ہی گھڑی ہوئی نہیں ہیں، بلکہ ان میں بعض ایسی بھی ہیں جن سے قدامت ظاہر ہوتی ہے اور بظاہر ابتدائی عہد (صحابہؓ کے زمانہ) میں گھڑی گئی ہیں۔[3]

(۴) بیشتر حدیثیں جن کو صحیح کہا جاتا ہے، وہ اس زمانہ کی نہیں ہیں، جن کی طرف ان کی نسبت کی گئی ہے، بلکہ وہ اسلامی شریعت میں بعد کے مرحلوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور ترقیوں کی درحقیقت دستاویز ہیں۔[4]

---

[1] (۱-۳) العقیدہ والشریعہ ص ۵۰، ۵۱۔ [4] العقیدہ والشریعہ ص ۵۰، ۵۱

(۵) قرآن میں چونکہ احکامات تھوڑے تھے، اس لئے علماء نے اسلام کو ایک مکمل اور جامع دین قرار دینے کے لئے حدیثیں گھڑیں، اور ان کو باقاعدہ اقوال رسولؐ کی حیثیت سے جمع کر لیا گیا۔[۲۵]

(۶) مسلمانوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں موجود قوانین اور عادات کو دینی رنگ دے کر مقدس حدیثوں کی شکل میں تبدیل کر لیا گیا ہے اور ان کی نسبت نبیؐ کی طرف کر دی گئی ہے۔[۲۶]

(۷) عہد نامہ قدیم وجدید (توریت و انجیل) کے بعض اقتباسات، حکماء کے اقوال، یونانی فلسفہ کے بعض اصول، ہندوستان اور فارس کی بعض حکمتیں وغیرہ بھی حدیث کا جزء بن گئیں اور یہ تمام چیزیں اسلام کی ملکیت میں شامل ہو کر اسلامی تعلیمات کہلانے لگی ہیں، حالانکہ اصل سے ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔[۲۷]

(۸) حدیث کے ذخیرہ میں بتدریج اضافہ ہوا ہے، ضرورت کے مطابق بعد کے زمانوں میں نئی حدیثوں کے ذریعہ قرآنی احکامات کی کمی کی تلافی کی جاتی رہی ہے۔[۲۸]

(۹) یہ تو وہ خیالات ہیں جن کا اظہار مشہور یہودی مستشرق گولڈزیہر (GOLDZIHUR) نے کئے ہیں۔ بعد کے مستشرقین نے بھی انہیں خیالات واوہام کا مختلف پیرایہ میں اعادہ وتکرار کیا ہے۔ البتہ شاخت SCHACHT نے یہ شوشہ بھی چھوڑا ہے کہ:۔

(۱) صحاح کی بیشتر احادیث امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے بعد وضع کی گئی ہیں اور احادیث کا پہلا قابلِ ذکر مجموعہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں وجود میں آیا ہے۔

(۲) فقہی مذاہب کی تائید کے لئے ہر مذہب کے پیروکاروں نے الگ الگ حدیثیں گھڑیں اور وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر حدیث وسنت کا جزء بن گئی ہیں۔[۲۹]

چونکہ انہیں شبہات کا اعادہ بار بار کیا جاتا رہا ہے اور خود مسلمانوں کی وہ نسل جو مغربیت زدہ ہے اور جس کے لئے کسی مستشرق کا نام ہی آجانا علمی استناد کے لئے کافی ہوتا ہے، ان خیالات کو اپنا کر طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئی اور ہو رہی ہے اور دوسروں کو راہِ حق سے بھٹکانے کا ذریعہ بھی بن رہی ہے۔ اس لئے آئیے ایک نظر ان کی معقولیت اور علمی وزن پر ڈال لیں تاکہ ان حضرات کی علمی قابلیت اور تحقیق

---

۲۹ اصول فقہ، ج ۱۴۴ - ۱۳۸

دیانت دونوں کا بھرم کھل جائے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو قابلِ لحاظ یہ ہے کہ: سنّت اور حدیث کی جو تعریف گولڈزیہر GOLDZIHER نے کی ہے، اس کے بارے میں علم اصولِ حدیث کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے۔ اس نے بدنیتی سے اس تعریف میں رسم و رواج اور عام عادتوں کا لفظ بھی بڑھا دیا ہے، جب کہ محدثین کے یہاں حدیث کی عام اصطلاحی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، اور ان واقعات کے مجموعہ کا نام ہے، جنکی آپ نے زبانِ حال سے تائید فرمائی ہو۔"[۵]

گولڈزیہر نے بڑی چالاکی سے "رسم و رواج" کا لفظ بڑھا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حدیث کا ذخیرہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے طور طریق اور افکار سے مکمل ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلی ہوئی جہالت یا دانستہ علم و انصاف کا خون کرنے کے مرادف ہے۔ اصولِ حدیث اور علم "جرح و تعدیل" (جس میں حدیث کی روایت کرنے والے راویوں کی پرکھ کی جاتی ہے) سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی اس طرح کا بچکانہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔

(۲) جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہزاروں روایتیں گھڑی گئی ہیں تو اس سے ہمیں انکار نہیں ہے، دوسری صدی ہجری میں اسلام دشمنوں کا ایک گروہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے اس میدان میں سرگرم رہا ہے، لیکن خدا نے اپنے دین کی حفاظت کی خاطر جس طرح محدثین کے گروہ کو اس کے مقابلے کے لئے کھڑا کر دیا اس کی نظیر دنیا کے کسی بھی مذہب کی اصل کتاب کے بارے میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ جرح و تعدیل کا عظیم فن اسی کے لئے وجود میں آیا، جس کے بارے میں اپنے ہی نہیں غیر بھی یہ شہادت دیتے ہیں کہ:-

"اسماء الرجال" کا علم مسلمانوں کی وہ خصوصیت ہے کہ جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے ذریعہ پانچ لاکھ سے زائد انسانوں کا مکمل اخلاقی ریکارڈ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔"

اس کی شہادت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہونے والی کتاب "الاصابہ" پہ ڈاکٹر اسپرنگر کا مقدمہ دیکھا جا سکتا ہے ———— الغرض محدثین نے صحیح اور غلط روایتوں کے درمیان

امتیاز کے ایسے مستحکم اصول مرتب کر دیے ہیں کہ اس کے بعد اس کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا کہ غلط اور موضوع روایتوں کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف باقی رہے، کیونکہ اصول کی روشنی میں صحیح، حسن، اور ضعیف روایتوں کی الگ الگ حد بندی کر دی گئی ہے، جس میں خلط و اشتباہ کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا اور دوسری طرف اسلام دشمنوں اور زندیقوں کی طرف سے جو روایتیں گھڑی گئی تھیں ان کو علٰحدہ کتابوں میں اس طرح مرتب کر دیا گیا ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ جان سکتا ہے کہ ناقابلِ اعتبار روایتیں کون سی ہیں اور قابلِ اعتبار کون سی۔

اسی طرح امام بخاریؒ اور امام مسلم وغیرہ کے پایہ کے محدثین نے ایسی کتابیں بھی تیار کر دی ہیں جن میں صرف صحیح روایتیں ہی لی گئی ہیں "حسن" اور "ضعیف" تک کی گنجائش بھی ان میں نہیں رکھی گئی ہے۔

جہاں تک اعتراض کے دوسرے جز کا تعلق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حدیث کی تحریری طور پر تدوین نہیں ہوئی تھی، اسلئے صحیح، غلط کا امتیاز باقی نہیں رہا تو ——— یہ بات کثرت سے لوگوں کی زبانوں پر آئی ہے، لیکن علم وتحقیق کی رو سے یہ نہایت ہی بے وزن بات ہے۔

تحقیق کی رو سے یہ بات ثابت ہے کہ خود صحابہؓ میں سے پچاس سے زائد نام ایسے ہیں جن کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا چھوٹا یا بڑا مجموعہ موجود تھا، جن میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا مرتب کردہ "الصادقہ" تو بہت ہی مشہور ہے[1]

(۳) صحابہؓ کے زمانہ میں حدیثوں کے گھڑے جانے کے سلسلہ میں دعویٰ بے دلیل ہے اور اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ منافقین اور اس زمانہ کے یہودیوں نے اس طرح کی حرکت کی بھی تھی تو اس سے صحیح حدیثوں کے ذخیرے پر کیا اثر پڑتا ہے؟ موضوع روایتوں کا خانہ ہی الگ ہے، وہ خواہ کسی زمانہ میں بھی گھڑی گئی ہوں ان کو محدثین نے مستقل اور علٰحدہ کتابوں میں جمع کر دیا ہے تاکہ لوگ ان سے ہوشیار رہیں اور پرہیز کریں[2]۔

---

[1] اس سلسلہ میں محمد عجاج الخطیب کی "السنۃ قبل التدوین" اور ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی کی "دراسات فی الحدیث النبویؐ" کا مطالعہ خاص طور پر بصیرت کا باعث ہوگا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا شائع کردہ صحیفہ ہمام بن منبہ بھی اس اعتراض کا ایک جواب ہے۔

(۴) یہ دعویٰ کرنا کہ احادیث کا ذخیرہ اس لئے وجود میں آیا ہے کہ اس کے ذریعہ اسلامی شریعت کا نقص دور کیا جائے، یہودی ذہنیت کی نکتہ آفرینی اور ایک ایسی بات ہے جس کا اظہار وہی شخص کر سکتا ہے جس کو نہ اسلامی شریعت کی حقیقت معلوم ہو اور نہ پیغمبرؐ کے منصب و مقام سے وہ واقف ہو۔

جب خود قرآن حکیم کے اندر یہ اعلان کھلے الفاظ میں موجود ہے کہ :- اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ○

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں" —— تو اس کے بعد اسلامی شریعت کے نقص اور پھر اس کی تلافی کا مسئلہ ہی کیا باقی رہ جاتا ہے؟ اور جب خود قرآنِ حکیم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری اور آپؐ کا منصب ہی یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی کی تفصیل اور توضیح ہے، اس کے بعد اسلامی شریعت تو نام ہی قرآن و حدیث دونوں کے مجموعہ کا ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے قرآن میں مذکور اصول و کلیات کو عملی زندگی میں برتنے کا طریقہ سکھایا، اور عبادات تک میں وہی طریقہ جزوِ دین قرار پایا، جو آپؐ نے اپنا کر دکھلایا تھا اور جس کی امت کو تعلیم دی تھی۔

گولڈ زیہر کے ہم قوموں نے جس طرح حضرت موسیٰؑ کی کتاب توریت میں تبدیلی کر کے اس کی صورت ہی مسخ کر ڈالی ہے، یا جس طرح عیسائیوں نے انجیل کو بدل ڈالا ہے، اس کا تو قرآن اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً اسی نفسیاتی احساس کو مٹانے کے لئے اسلامی تعلیمات میں تبدیلی کا تخیل گولڈ زیہر نے اپنے ذہن میں قائم کیا ہے۔ لیکن :-

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

(۵) لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ قرآن میں جامع اصول و کلیات ذکر کئے گئے ہیں، حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کی تفصیل و تبیین کی گئی ہے۔ قرآنی احکام میں کمی، کا تصور یا اس کی بعد کے زمانہ میں تکمیل کا خیال اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت یا دانستہ افترا پردازی کا کرشمہ ہے۔

(۶) جن ممالک کو مسلمانوں نے فتح کیا تھا چاہے وہ روم کا علاقہ ہو یا فارس کا، یا خود جزیرۃ العرب کا وہاں کی تہذیب کا بنیادی عنصر شرک اور توہم پرستی تھا۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں سب سے زیادہ زور شرک اور بت پرستی کو مٹانے پر ہے، پھر سلامتیِ ہوش اور عقل کے ساتھ

کوئی شخص گولڈ زیہر کے اس دعوے کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے کہ احادیث کا ذخیرہ مفتوحہ ممالک کی ثقافت وتہذیب سے ماخوذ ہے؟

ان مفتوحہ ممالک میں نہ تو عقائد اس طرح کے تھے جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور نہ وراثت، نکاح، طلاق، حدود و تعزیرات کے ایسے قوانین تھے، جن کو اسلامی شریعت سے کوئی مناسبت ہو۔ اس طرح روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا اسلامی طریقہ بھی ان قوموں میں مروج نہیں تھا، جن کی تعلیم احادیث کے ذریعہ دی گئی ہے۔ پھر کس بنیاد پر ایسا غیر علمی اور غیر سنجیدہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ احادیث کا ذخیرہ ان قوموں سے لیا گیا ہے۔

افسوس کہ اس طرح کے بے سر و پا دعووں اور تحقیقات پر بعض دین باختہ لوگ سر دھنتے ہیں اور گولڈ زیہر جیسے لوگوں کو علمی میدان کا شہسوار تصور کرتے ہیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

(۷) موجودہ توریت میں حضرت عزیرؑ کی ابنیت کا تصور اور انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی ابنیت اور تثلیث کا مسئلہ ہی اس اختراع کی تردید کے لئے کافی ہے کہ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو دور کی نسبت بھی حاصل نہیں ہے۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت مریمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت ایوبؑ وغیرہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں موجودہ عہد نامہ قدیم و جدید سے پیدا ہوتی ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ازالہ فرمایا ہے اور ان انبیاءؑ و مصلحین کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تحریف شدہ توریت و انجیل کے بیانات کی تردید کی ہے، پھر حدیثوں کے ان سے ماخوذ ہونے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

اس سے بھی زیادہ بدترین اور غیر سنجیدہ بات، یونانی فلسفہ سے احادیث کے ماخوذ ہونے کا مسئلہ ہے ____ فلسفہ یونان کو مسلمانوں نے پروان چڑھایا، اس پر تنقیدیں کیں، اس کے بت پرستانہ اصولوں پر مبنی الٰہیات سے متعلق تصورات کی سختی سے تردید کی، آج بھی فلسفہ یونان کا سارا ذخیرہ موجود ہے، کوئی ادنیٰ سی مناسبت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ان متضاد آراء و نظریات میں نہیں بتلائی جا سکتی، جو یونانی فلاسفروں نے اختیار کئے تھے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گولڈ زیہر نے یونانی فلسفہ کا صرف نام ہی سنا تھا اور جس طرح

حدیث اور اصولِ حدیث کے فن سے وہ بے بہرہ تھا، اس طرح یونانی فلسفہ کے کوچوں کے سیر کی بھی اہمیں صلاحیت نہیں تھی، ورنہ اتنا لغو اور بے بنیاد دعویٰ وہ نہیں کر سکتا تھا، اور اگر جانتے ہوئے اس نے یہ دعویٰ کیا ہے تو درحقیقت یہودی عداوت اور اسلام کے بارے میں بغض و نفرت کی ذہنیت نے اس کی بصیرت ختم کر دی تھی، جس نے یہ احساس بھی اس کے ذہن سے مٹا دیا تھا کہ اس طرح کی باتوں سے اس کی ظاہری علمی شہرت پر بھی حرف آئے گا۔

(۸) قرآن کے ناقص ہونے کے تصور، اور احادیث کے ذریعہ اس کی تکمیل کے خیال کی تردید پہلے کی جا چکی ہے۔

آئیے اب ایک نظر ان خیالات پر بھی ڈال لیں جن کا اظہار شاخت SCHACHT نے کیا ہے:۔

(۱) اس کا یہ کہنا ہے کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے بعد وہ احادیث گھڑی گئیں جن کو صحیح کہا جاتا ہے۔

اب اس جہالت کو کیا عنوان دیا جائے کہ خود امام مالکؒ نے اپنے قلم سے "مؤطا" جیسی اہم کتاب مرتب کر رکھی ہے، جس میں ہزاروں صحیح احادیث موجود ہیں۔

اور امام مالکؒ سے قبل ابن شہاب، زُہریؒ، ابن جُریجؒ، ابوبکر عمرو بن حزمؒ جیسے بلند پایہ محدثین احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کر چکے تھے۔ پھر کسی دلیل کے بغیر یہ دعویٰ کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ جو حدیثیں صحاح کی کتابوں میں موجود ہیں وہ ان ائمہ کے بعد گھڑی گئی ہیں، جب کہ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور خود امام شافعیؒ نے انہیں حدیثوں کو اپنی فقہ کی بنیاد بنائی ہے اور ان سے ہزاروں مسائل مستنبط کئے ہیں۔ اگر وہ حدیثیں ان کے زمانہ کے بعد گھڑی گئی ہوتیں تو پھر ان لوگوں نے ان سے مسائل کس طرح مستنبط کئے اور ان کو اپنی دلیل کی حیثیت سے کس طرح ذکر کیا، ایک ایسی چیز جس کا سرے سے اس وقت تک وجود ہی نہ ہو اس سے استدلال کس طرح کیا جا سکتا ہے، کیا اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب دعویٰ کوئی ہو سکتا ہے؟

(۲) شاخت SCHACHT نے دوسرا شوشہ یہ چھوڑا ہے کہ فقہاء نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لئے حدیثیں گھڑی ہیں، حالانکہ تمام فقہاء کی نظر میں یہ اجتماعی مسئلہ ہے کہ:۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اگر کوئی غلط بات منسوب کرے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔"

اس حقیقت پہ سب کا ایمان ہے، کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہے۔

فقہاء نے ایک دوسرے پر یہ الزام تو قائم کیا ہے کہ صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے بعض مسائل میں عقلی اجتہاد سے کام لیا گیا ہے اور کسی دوسری حدیث یا قرآنی آیت کی بنا پر اس میں تاویل کی گئی ہے، لیکن فقہی خلافیات کی پوری تاریخ اس الزام سے یکسر پاک ہے کہ کسی نے اپنے مذہب کو ثابت کرنے کے لئے حدیث گھڑلی ہو۔ جب موضوع روایت حجت ہی نہیں ہے تو پھر گھڑنے کا کیا فائدہ؟ اور اس سے کوئی دینی مسئلہ کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے؟

امید ہے کہ یہ بات پورے طور پر واضح ہو گئی ہو گی کہ مستشرقین نے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو افترا پردازیاں کی ہیں ان کی نہ کوئی علمی بنیاد ہے، اور نہ ان میں کسی طرح کی معقولیت ہے، دینی تعصب اور اسلام دشمنی کے جذبہ نے متضاد قسم کے خیالات کا ان سے اظہار کرایا ہے، گولڈ زیہر، اور شاخت ان مستشرقین کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں، جب ان کے نظریات کا یہ حال ہے تو اوروں کو انہیں پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ۔

مولانا زبیر احمد قاسمی
شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل السلام

اعضاء کی پیوند کاری

دورِ حاضر میں فنِ سرجری کی ترقی سے جو چند مسائل سامنے آئے ہیں ان میں ایک انسانی اعضاء کی پیوند کاری کا مسئلہ بھی ہے، اگرچہ ماضی قریب میں اکابر علماء اس پر اظہارِ خیال فرما چکے ہیں، تاہم ضرورت مقتضی تھی کہ اس مسئلہ پر دوسرے رخ سے بھی غور کیا جائے۔

زیر نظر مقالہ اسی قسم کی ایک کوشش کا نتیجہ ہے، جو دراصل ایک موضوعِ بحث کو سامنے لاکر علماء کو دعوتِ فکر دینا ہے۔

ہمارے خیال میں اس مسئلہ سے متعلق کسی نتیجہ پر پہونچنے میں درجِ ذیل نصوص اور قواعدِ شرعیہ کو دلیلِ راہ بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک نفس کی حفاظت اور اس کے احیاء کی کوشش گویا تمام انسانوں کے بچانے کے برابر ہے:-

مَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ۔ ایک شخص کی زندگی کا تحفظ تمام لوگوں کی زندگی کے تحفظ کے مماثل ہے۔

حدیث میں یہ واقعہ ملتا ہے:-

روی الطحاوی باسنادہ الی عرفجة بن سعد انه اصیب انفه یوم الکلاب فی الجاهلیة فاتخذ انفًا من ورق فانتن علیه فامره النبی صلی الله علیه وسلم ان یتخذه انفا من ذهبٍ ففعل۔

عرفجہ بن سعد کی ناک دورِ جاہلیت کی کلاب نامی جنگ میں کٹ گئی تو انہوں نے چاندی کی ناک بنوالیا مگر اس میں جب بدبو ہونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق سونے کی ناک بنوالیا۔

اس حدیث سے زمانۂ رسالت میں اعضاء کی پیوند کاری کے واقعہ کا ثبوت بھی ملتا ہے اور

یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پیوند کاری میں ایسی چیزوں کا استعمال بھی جائز ہے جسے عام حالتوں میں مردوں کیلئے اس کا استعمال صحیح نہیں، نیز اس کا بھی سراغ ملا کہ پیوند کاری کسی عضو کی بناوٹ وسجاوٹ کے ارادہ سے ظاہری بدنمائی اور عیب کو زائل کرنے کے لئے بھی کی جا سکتی ہے۔ ادھر شریعت کے کچھ احکام از قبیلِ عزیمت ہیں اور کچھ مخصوص حالتوں میں بہ طریق رخصت ——— اور احکامِ رخص سے استفادہ عین منشا رشریعت ہے ——— قواعدِ شرعیہ میں "الضرر یزال" (ضرر لائق ازالہ چیز ہے) اُلضرورۃ تُبِیحُ المحظورات" ضرورت بہت سی ممنوع چیزوں کو بھی مباح قرار دیتی ہے اور "الضرورۃ تیقدر بقدر الضرورۃ" (ضرورتاً جس کی اجازت ہوتی ہے وہ اسی حد تک صحیح ہوتی ہے، جتنی ضرورت ہو) ——— جیسے قواعد بھی موجود ہیں۔ پھر ضرورت کا مفہوم علماء یوں متعین کرتے ہیں:-

معنی الضرورۃ ھھنا ھو خوف الضرر علی نفسہ او بعض اعضاءہ۔	وہ صورت حال جس میں جان یا اعضاء انسانی کو ضرر ہونے کا خطرہ ہو جائے ضرورت کہلاتی ہے۔
(احکام القرآن ج ۱ ص ۱۲۹)	

اس کے علاوہ۔

الانتفاع بالمحرم للتداوی جائز۔	حرام اشیاء سے بغرض دوا و علاج فائدہ اٹھانا صحیح ہے۔

تمام کتب فقہ میں مفتی بہ قول کی حیثیت سے منقول بھی ملتا ہے، اس لئے ان نصوص اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں پیوند کاری سے متعلق متوقع سوالات کے مختصر جواب یہ ہوں گے:-

۱۔ حدیث عرفجہ سے عیب وشین کے ازالہ کے لئے پیوند کاری کا ثبوت ملتا ہے تو نفس یا اعضاء کی حفاظت یا اس کی صلاحیت اور کارکردگی کو بڑھانے کے لئے پیوند کاری بدرجۂ اولیٰ صحیح ہوگی، لیکن سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس مقصد کے لئے کن چیزوں کا استعمال کیا جائے، تو ظاہر ہے کہ شریعت نے اس کائنات کی بعض چیزوں کو ممنوع الاستعمال قرار دیا ہے، اور بعض کو علی الاطلاق مباح الاصل کہا ہے اور فرمایا گیا ہے:-

تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا	یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں اس حد سے آگے مت بڑھو

اسلئے اولاً مباح الاصل اشیا رہی سے ضرورتیں پوری کی جائیں گی۔ چنانچہ پہلی کوشش تو یہ ہوگی کہ لوہا، پلاسٹک، المونیم اور خنزیر جیسے نجس العین جانوروں کے سوا دیگر جانوروں کے اعضاء ہی سے یہ مقصد حاصل کرلیا جائے، جانور ماکول ہوں یا غیر ماکول، اگر اسے شرعی قاعدہ کے مطابق ذبح کرلیا گیا ہو تو اس کے تمام اعضاء پاک اور لائق انتفاع ہوجاتے ہیں، ماکول ہوں گے تو کھایا بھی جاسکتا ہے، ورنہ خارجی استعمال صحیح ہوگا۔ شامی کتاب الذبائح میں ہے:۔

ذبح مالا یوکل لحمہ یطھر لحمہ وشحمہ وجلدہٗ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

جن جانوروں کا کھانا حرام ہے اس کو شرعی قاعدہ کے مطابق ذبح کردیا جائے تو اس کا گوشت، چربی اور چمڑا پاک ہوجاتا ہے

بلکہ بعض اعضاء مثلاً بال، ہڈی، اعصاب، کھر، سینگ تو علی الاطلاق قابل انتفاع ہیں، چاہے مذبوحہ کے ہوں یا میتہ کے۔ جامع صغیر ص۹۵ میں ہے:۔

لاباس ببیع عظام المیتہ وعصبھا وصوفھا وشعرھا وقرنھا ووبرھا والانتفاع بذالک کلہ۔

میتہ کی ہڈیوں، سینگ اور بالوں وغیرہ کی بیع شراء میں کوئی حرج نہیں اور نہ اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی قباحت ہے۔

تو جب تک یہ مقصد ان پاک و حلال اشیاء سے حاصل ہوتا رہے گا، بلا ضرورت محظورات کا استعمال صحیح نہیں ہوگا۔ ورنہ پھر "الضرورۃ تبیح المحظورات" ضرورت بہت سی ممنوع چیزوں کو بھی مباح کردیتی ہے۔

اور "الضرر یزال" کے تحت تداوی بالمحرم کے طور پر ان چیزوں کے استعمال کی بھی رخصت ہوگی جسے عام حالتوں میں ممنوع الاستعمال قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ خنزیر کے اعضاء کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کی رخصتِ شرعیہ مل جائے گی

آیتِ اباحت نے بحالت اضطرار میتہ، دم، لحم خنزیر کے کھانے کی جب اجازت دیدی ہے تو عند الضرورت اس کے اعضاء سے انتفاع اور اس کا خارجی استعمال بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا۔ علامہ شامیؒ نے ج ۴ ص۱ میں لکھا ہے:۔

قال الزیلعی والاول ھو الظاھر لان الضرورۃ تبیح لحمہ فالشعر اولیٰ۔

بحالتِ اضطرار جب خنزیر وغیرہ کا گوشت کھانا مباح ہے تو اس کے بال کا استعمال بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

سطورِ بالا سے جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل عزیمت تو یہی ہے کہ انسان اپنی تمام ترضرورتیں حلال اور پاک اشیاء ہی سے پوری کرے، لیکن بوقت ضرورت حرام اشیاء سے بھی انتفاع و استفادہ کی رخصت مل سکتی ہے۔ تو یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرورتاً انسانی اعضاء کے استعمال کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے۔ لیکن انسانوں میں زندہ اور مردہ کے حکم میں فرق ہوگا۔ کوئی زندہ انسان اگر کسی مضطر، جان بلب کو اجازت بھی دیدے، تو بھی شرعاً یہ جائز نہیں کہ وہ مضطر زندہ انسان کے عضو کو کاٹ کھائے اور اپنی جان بچائے۔ شامی ج ۵ ص۲۳۰ میں لکھا ہے:

خاف الموت جوعًا وان قالہ الآخر اقطع یدی وکلھا لا یحل۔	بھوک سے جان بلب شخص کو دوسرا یوں کہے کہ میرا ہاتھ کاٹ کر کھا جاؤ تو بھی کھانا جائز نہیں ہوسکتا۔

بخلاف مردہ انسان کے گوشت کھانے کی بحالتِ اضطرار اجازت ثابت ہے۔ الاشباہ والنظائر ص۱۲۷ میں لکھا ہے:۔

ولو اضطر وعندہٗ صید ومال غیر فالصید اولیٰ وکن الصید اولیٰ من لحم الانسان وعن محمدٍ الصید اولیٰ عن لحم الخنزیر۔	اگر جاں بلب شخص کے پاس شکار حرام اور دوسرے کا مال دونوں موجود ہو تو وہ شکار کھا کر جان بچائے اور اسی طرح انسانی گوشت اور خنزیر کھا کر جان بچانے سے بہتر ہے کہ شکار کھا کر جان بچائے۔

اس سے "اختر اھو نہما" (جب دو ناپسندیدہ چیزوں میں سے کسی ایک کے ارتکاب و استعمال کی نوبت آجائے تو ان دونوں میں سے جو کمتر ہو اسے اختیار کرنا چاہیئے) کے اصول کے مطابق کسی نہ کسی درجہ میں ضرورتاً لحم انسان اور لحم خنزیر سے انتفاع کا جواز نکل آیا۔

لیکن زندہ اور مردہ انسانوں کے اعضاء سے انتفاع کا حکم یقیناً مختلف ہوگا۔ کتب فقہ میں تصریح ملتی ہے:۔

ان ایصال ان لم الی الحیوان لا یجوز شرعًا الا لمصالح تعود الیہ (بحر مسائل شتی ص۲۵۵)	کسی ذی روح کی ذاتی مصلحت و منفعت کے بغیر اس کو تکلیف پہونچانا شرعاً جائز نہیں۔

شرح السیر الکبیر، ص۲۶۹ میں ہے:۔

ان المسلم لا یحل لہ ان یقی روحہ	کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنی جان جیسی

بروح من هو مثله في الحرمة ۔

محترم کسی جان کو برباد کرکے اپنی جان بچائے ۔

بحر ص ۲۰۵ ج ۸ میں ایک لمبی عبارت کا آخری جزئیہ ہے :-

لان احياء نفس بقتل نفس اخرى لم يرد في الشرع ۔

کسی جان کو قتل کرکے کسی جان کا بچانا اس کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ملتا ۔

ان مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ زندہ انسان افادۂ غیر کے لئے اگر اپنے اعضاء کی قطع برید کی اجازت بھی دیدے تو شرعاً اس کی اجازت غیر معتبر ہوگی۔ ایک مسلمان کو اپنی ذات پر بھی خلاف شرع تصرف کا کوئی حق نہیں ہے، اور قاعدہ شرعیہ ہے :

الضرر لا يزال بالضرر ——— کسی کو ضرر میں ڈال کر دوسرے کو ضرر سے بچانا صحیح نہیں

اس لئے زندہ انسان کے اعضاء کی قطع و برید اور دوسرے جسم میں اس کی پیوند کاری شرعاً جائز نہیں ہو سکتی ۔

خاص حالات میں چونکہ بعض اجزاء انسانی سے انتفاع اور تداوی کی اجازت فقہی جزئیہ سے ثابت ہو رہی ہے۔ مثلاً شامی نے ص ۱۱۸ ج ۴ بیع فاسد میں لکھا ہے :

ان اهل الطب يثبتون نفعاً للبن البنت وهي من افراد مسئلة الانتفاع بالمحرم للتداوي كالخمر واختار في البناية والخانية الجواز اذا فيه الشفاء ولم يجد دواءً غيرها ۔ .. ..

طبیب عورتوں کے دودھ میں نفع تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح انسانی دودھ سے انتفاع کا مسئلہ دوائً انتفاع بالحرام کے قبیل سے ہو جاتا ہے، تو ضرورتاً شراب کی طرح اس سے بھی انتفاع جائز ہوگا چنانچہ خانیہ اور بنایہ میں ہے کہ اگر اس سے صحت و شفاء کی توقع ہو اور اس کے علاوہ کوئی دوا اس مرض کی نہ ہو تو انسانی دودھ کا استعمال جائز ہے ۔

حالتِ اضطرار میں لحم انسان سے انتفاع کی اجازت اوپر مذکور ہو چکی، پھر کسی نفس محترم کی حفاظت، بلکہ مال کو بھی ضیاع سے بچانے کے لئے میت کی چیر پھاڑ کی اجازت کتبِ فقہ میں مصرح ہے :

امرأة حامل ماتت فاضطرب الولد

حاملہ عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں

فی بطنها فان کان اکبر رأیه انه حی يشق بطنها لان ذالك تسبب فی احياء نفس محترمة بترك تعظيم الميت فالاحياء اولی ويشق بطنها .... ونقل الجرجانی شق بطنه للمال لان حق الآدمی مقدم علی حق الله ان کان حرمته الميت حقاً لله تعالی وان کان حقاً للميت فحق الآدمی الحی مقدم علی حق الميت لاحتياج الحی الی حقه ـ (بحر ص۲۰۵/۸)

بچہ حرکت کرتا ہوا محسوس ہو اور اس کی زندگی کا گمان غالب ہو تو پیٹ چاک کیا جائے گا اور میت کی تعظیم و حرمت کو چھوڑ کر نفس محترم کی زندگی بچائی جائے گی، نقل جرجانی کے مطابق مال نکالنے کیلئے بھی میت کا پیٹ چاک کیا جائے گا، کیونکہ حرمتِ میت اگر حق اللہ کی حیثیت سے واجب الاحترام ہے تو یہاں آدمی کے حق کو حق اللہ پر تقدم ہوگا اور اگر حرمتِ میت خود میت کا حق ہے تو زندہ کے حقوق کی رعایت مردہ کے حق سے بڑھ کر ہوگی چونکہ زندہ رہنے کے حق کے حصول کا زیادہ محتاج ہوا کرتا ہے۔

آگے لکھا ہے :-

وفی النوادر امرأة حامل اعترض الولد فی بطنها ولا یمکن خروجه الا بقطعه اربا ولو لم یفعل ذالك یخاف علی امه من الموت فان کان الولد میتا فی البطن فلا باس به وان کان حیا لا یجوز ـ

.. ..

حاملہ عورت کے پیٹ میں اگر بچہ اس طرح الٹ پلٹ جائے کہ اب اسے ٹکڑے ٹکڑے کئے بغیر نکلنا ممکن نہ ہو اور اس کے بغیر عورت کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے تو اگر بچہ کے مردہ ہونے کا ظن غالب ہے تو بلا تاخیر بچہ کو ٹکڑا کر کے نکال لیا جائیگا، لیکن اگر بچہ کا زندہ ہونا معلوم ہو رہا ہو تو پھر بچہ کی قطع برید جائز نہ ہوگی۔

اس سے کھل کر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی کی زندگی بچانے کے لئے کسی زندہ انسان کے اوپر سرجری کا عمل نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن اس مقصد کے لئے مردہ انسان کے اعضاء کی قطع برید ہو سکتی ہے، اب اگر میت کے محض قطع و برید ہی سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہو، بلکہ ضرورت مقتضی ہو اس کی پیوند کاری کی تو :-

الامور بمقاصدها ....
....

اعمال و افعال کی شرعی حیثیت کا تعین دراصل اس کے پس منظر اور مقصد کے مطابق ہی ہوا کرتا ہے۔

کے تحت اس کی بھی اجازت دی جا سکتی ہے ——— خلاصہ یہ نکلا کہ جب انسانی اجزاء سے تداوی اور انتفاع ثابت ہے، احیاء نفس کے لئے میت کی چیر پھاڑ اور اس کے اعضاء کی قطع و برید بھی صحیح ہے،

تو "الضرورۃ تبیح المحظورات" کے تحت احیاء نفس کی ایک محمود و مشکور کوشش کے طور پر عند الضرورت اس کی رخصت ہوگی کہ کسی مردہ انسان کے اعضاء کو دوسرے انسان کے جسم میں لگادیے جائیں اور ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اپنے مرنے کے بعد اپنے جسم کے اعضاء کو نکالنے کی اجازت دیدے، کیونکہ اس کی یہ اجازت منشاء شریعت کے مطابق ہوگی، اس میں مسلم، غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہوگا، کیونکہ رخصتِ شرعیہ سے استفادہ کی اجازت تو عاصی و مطیع ہر ایک کے لئے ہے۔

یہاں کتب فقہ کی بعض وہ عبارتیں شبہ پیدا کرسکتی ہیں، جس میں عظم خنزیر اور عظم آدمی سے تداوی کی ممانعت کا ذکر ہے، مثلاً صاحب بحر نے لکھا ہے:

قال محمد فی السیر الکبیر لا باس بالتداوی بالعظم اذا کان عظم شاۃ او بقر او بعیر او فرس او غیرہ من الدواب الا عظم الخنزیر والآدمی فانہ لا یمکن التداوی بھما۔

بکرا، گائے، بیل اونٹ اور گھوڑے وغیرہ بڑے بڑے جانوروں کی ہڈیوں سے (پیوند کاری کی شکل میں) علاج کرانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن آدمی اور خنزیر کی ہڈیوں سے دوا اور علاج ممکن نہیں اسلئے جائز نہیں۔

اس لئے وضاحتاً یہاں اتنا عرض کردینا مناسب ہے کہ کوئی فقیہ اور مجتہد اپنے زمانہ اور اپنے مخصوص ماحول کے تقاضوں سے صرف نظر کرکے کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتا ہے اور دور ماضی میں عظم خنزیر یا اجزاء انسانی سے تداوی کا تصور ہی نہیں تھا، جیسا کہ "لا یمکن تداوی بھما" کی تعبیر بھی دلالت کرتی ہے، اس کی افادیت اور اس سے انتفاع کے طریقے بھی معلوم نہیں تھے، اس کا پتہ بھی نہ تھا کہ خنزیر یا انسان کے اجزاء سے بھی کسی انسان کے مرض کا علاج ممکن ہے اور ان اجزاء خنزیر و انسان کو خاص انداز سے استعمال کرکے کسی انسان کو تکلیف سے نجات و شفاء دلائی جاسکتی ہے اور جب کسی ممنوع الاستعمال اشیاء کی افادیت کا علم ہی نہ ہو تو اس کے استعمال کی ضرورت کا تحقق بھی نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے فقہاء نے افادیت کے عدم علم کی بنیاد پر اس سے تداوی کو ناجائز کہہ دیا، لیکن آج جب کہ اس کی افادیت اور اس سے انتفاع کے مناسب و معقول طریقے معلوم ہوچکے ہیں، اس سے شفاء کا حصول بھی ایک امر مشاہد بن چکا ہے تو اس کے استعمال کی ضرورت و احتیاج کا تحقق بھی ایک واقعہ بن چکا ہے، اس لئے آج کا شرعی حکم یقیناً وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا۔ علامہ شامی نے جو یہ لکھا ہے:-

وما قيل ان الاستشفاء بالحرام حرام غير مجرى على اطلاقه وأن الاستشفاء بالحرام انما لا يجوز اذا لم يعلم ان فيه شفاء اما اذا علم وليس له دواء غيره يجوز۔ .. ..

فقہاء جو یہ کہتے ہیں کہ حرام چیزوں سے علاج کرانا جائز نہیں وہ مطلق نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں ہے، جب اس حرام چیز کا شفا بخش اور مفید ہونا مظنون نہ ہو، لیکن جب اس کا شفا بخش ہونا کسی ذریعہ سے معلوم ہو جائے اور کوئی دوسرا ذریعۂ علاج بھی نہ ہو تو جائز رہے گا۔

اس سے ہمارے خیال کی کھلی تائید ہوتی ہے، چنانچہ مجتہد فیہ احکام میں اختلافِ زمانہ سے حکم میں تبدیلی ایک معروف مسئلہ ہے، کبھی خنزیر کے بال کے متعلق یہ لکھا جاتا تھا:۔

ويجوز الانتفاع للخرز لان ذالك العمل لا يتاتى بغيره۔ .. ..

خنزیر کے بال سے جوتے کی سلائی وغیرہ کا کام لیا جا سکتا ہے، چونکہ یہ کام اس کے علاوہ دوسری چیز سے لینا آسان نہیں۔

لیکن آج درمختار، بر حاشیہ شامی صفحہ ۱۱۴ میں یہ لکھا ہے:۔

ولعل هذا في زمانهم اما في زماننا فلا حاجة اليه كما لا يخفى۔ .. ..

شاید یہ ان کے زمانہ میں رہا ہو، لیکن ہمارے زمانہ میں (مضبوط تروھاگے کے سبب) اس کی ضرورت و احتیاج نہیں رہی۔

مزید تائید مسئلہ حیات سے ہوتی ہے کہ سانپ سے انتفاع کی شکل اور اس کی افادیت جب تک فقہاء کے علم میں نہیں آسکی تھی اس کی بیع وغیرہ کو ناجائز کہتے رہے اور جب اس کی کسی حیثیت میں افادیت کا علم ہو گیا تو فقیہ ابواللیث نے اس کی بیع کو جائز قرار دیدیا:

جوز ابو الليث بيع الحيات ان انتفع والا لا۔

سانپ سے اگر انتفاع کی صورت نکل آئے تو اس کی بیع و شراء جائز ہے ورنہ نہیں۔

ان نظائر کی روشنی میں دورِ حاضر کے مفتی کو حق ہے کہ آج جب کہ انہیں اجزاء خنزیر یا اجزاء انسانی کی افادیت اور اس سے انتفاع و استشفاء کی شکلیں معلوم ہو چکی ہیں تو ضرورت متحقق ہونے پر اس سے انتفاع اور علاج و معالجہ کی خواہ بصورت پیوندکاری ہی کیوں نہ ہو اجازت دیدے۔

یہاں ایک خلجان کسی کو یہ ہو سکتا ہے کہ اجزاء انسانی سے معالجہ میں انسانی نعش کی حرمت پامال ہوگی۔

جو اس کی کرامت کے خلاف ہے۔ تو اولاً "انما الاعمال بالنیات" اور "الامور بمقاصدہا" سے اس کا دفعیہ ہو سکتا ہے۔ ثانیاً یہ دیکھنا ہو گا کہ کسی شئے کے احترام اور ہتک حرمت کے تحقق میں عرف و عادت کو بھی کچھ دخل ہے یا نہیں، تو بعض فقہی مسائل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عرف و عادت کو یقیناً دخل ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کو نیچے فرش پر رکھ کر اس کے قریب کسی تخت پر کوئی بیٹھ جائے تو اس کو قرآن کی ہتک حرمت اور بے ادبی کہا جاتا ہے۔ لیکن فرش ہی پر سیدھا کھڑا ہو جائے تو باوجودیکہ اس کے اعضاء ظاہری طور پر قرآن پاک سے مزید کچھ بلندی اونچائی پر جا چکے مگر اسے قرآن کا احترام ہی سمجھا جاتا ہے، حکموں کا یہ اختلاف محض اس بنیاد پر ہے کہ پہلی صورت عرفاً خلاف ادب سمجھی جاتی ہے اور دوسری صورت عرف و عادت میں اظہار احترام کا نشان بن چکی ہے۔

اب اگر انسانی نفس کی حفاظت یا اس کے اعضاء کی کارکردگی کو بڑھانے اور قوت و صلاحیت کو مستحکم بنانے کے نیک و مستحسن مقصد کے تحت اعضاء کی قطع و برید اور پھر پیوند کاری کی جائے تو معلوم نہیں کون سا عرف اسے میت کی ہتک حرمت قرار دے سکتا ہے اور ایسا عرف کس حد تک قابلِ التفات بن سکتا ہے۔

اگر ان ساری مصلحتوں اور مذکورہ بالا دلائل و قرائن کے مقتضاؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے تسلیم ہی کر لیا جائے کہ میت کی قطع و برید اور پیوند کاری کی شکل میں اس سے علاج و معالجہ علی الاطلاق میت کی ہتک حرمت کو مستلزم ہی ہے تو میں کہوں گا کہ پھر عند الضرورت اسے گوارا کیا جانا چاہیے۔

بحر ۸/۲۰۵ کی وہ عبارت جو پہلے نقل ہو چکی ہے، یعنی:- "شق بطنہ للمال لان حق الآدمی مقدم علی حق اللہ، ان کان حرمۃ المیت حقا للہ وان کان حقا للمیت فحق الآدمی الحی مقدم علی حق المیت لاحتیاج الحی الی حقہ" ——— اس پر غور کیا جائے۔

کیا اس فقہی جزئیہ کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حرمت میت اگر از قبیل حقوق اللہ ہے تو:

انتم الفقراء واللہ غنی حمید ——— تم لوگ محتاج ہو، اللہ غنی ہے۔

کے تحت عند الضرورت اس کی ہتک گوارا کی جا سکتی ہے ——— اور اگر یہ میت ہی کے حقوق میں سے ہے تو:-

اذا ابتلیت ببلیتین فاختر اھونھما ——— جب دو دشواریوں میں گھر جاؤ تو ان میں سے آسان کو اختیار کرو۔

... ...

کے اصول کے مطابق ایک نفسِ محترم کو بچانے کے لئے احترامِ میت کی پامالی برداشت کی جائے گی۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "المغنی" کا ایک جزئیہ نقل کر دیا جائے جو اس مسئلہ میں تقریباً نص ہے ــــــــــــــــــــ المغنی مع الشرح الکبیر ۳۰۳؁ ج ۲ میں مرقوم ہے :۔

"لان حرمۃ الحی وحفظ نفسہ اولی من حفظ المیت عن المثلہ لان زوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل مسلم ولان المسلم لو بلع مال غیرہ سق بطنہ لحفظ مال الحی وحفظ النفس اولی من حفظ المال"

نفس زندہ کی حرمت اور اس کے جان بچانے کی مصلحت میت کو مثلہ ہونے سے بچانے کی کوشش کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے، کیونکہ پوری دنیا کا ختم ہو جانا خدا کے نزدیک ایک مسلم کے قتل سے زیادہ کمتر ہے۔ نیز اگر کوئی مسلمان شخص دوسرے کا مال نگل کر مر جائے تو زندہ آدمی کے محض مال کی حفاظت کی خاطر اس کا پیٹ چاک کیا جائے گا۔ تو جان کی حفاظت تو مال کی حفاظت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ضروری ہے ــــــــــ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

بقیہ: خبرنامہ - بنجارہ ہلز کی ایک مجلس (جس میں جناب امجد علی خاں آئی اے ایس، ڈاکٹر حمید علی خاں، جناب مقبول صاحب اور دوسرے خواص و تعلیم یافتہ حضرات موجود تھے) کو جناب جعفر صاحب کی دعوت پر محترم صدر صاحب نے "اسلام کی حکمت دعوت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ جناب الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب صدر مجلس انتظامیہ نے بھی مختلف مقامات کے تبلیغی دورے کئے، مولانا مفتی عبدالودود صاحب نے بھی تین دنوں کے لئے گنٹور کا دعوتی سفر کیا اور طلباء کی جماعتیں بھی نکلتی رہیں، جو قریب کے محلوں میں جاکر دعوتی اور تبلیغی کام کیا کرتی ہیں۔

پیچیدہ مسائل
شرعی حل
مخلصانہ مشورے

اسلام اور وقف

مولانا میر الیاس علی القاسمی (نلگنڈہ)

اسلام ہی ایسا معتدل مذہب ہے جس کے سایہ میں ہر امیر وغریب خوش حال زندگی گذار سکتا ہے، یہی مذہب ہے جس نے ہر دو طبقوں کے لیے ایسے زریں اصول بنائے کہ اس کی روشنی میں دونوں باہم مربوط رہ سکتے ہیں اور جس کے ذریعہ ایک طبقہ اپنی زندگی میں تقویٰ وطہارت، محبت ورافت، شفقت ومودت، ہمدردی وغم خواری، غم گساری وفیاضی جیسی عظیم صفات پیدا کرسکتا ہے تو دوسرا طبقہ اپنے معاشی مسئلہ کا حل نکال سکتا ہے اور نفرت کی بجائے محبت، عداوت کی بجائے اخوت اور شکر وایثار کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔ وہ قانون ہے زکوٰۃ کا۔ وہ اصول ہے انفاق فی سبیل کا۔ وہ ضابطہ ہے مداینت کا (یعنی قرض وادھار کا) وہ اصول ہے وقف کا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے امراء پر نظام زکوٰۃ لاگو کردیا۔ اس کے ساتھ ہی انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب بھی دی اور کہیں دولت کی مذمت کی گئی کہ دولت فتنہ ہے اور کہیں دولت کی پرستاری کو اللہ کی رحمت سے محرومی کا ذریعہ بتایا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔ لعن عبد الدینار ولعن عبد الدرھم کہ درہم ودنانیر کا پرستار اللہ کی رحمت سے محروم ہے اور کہیں حکیمانہ انداز میں مومن کو مال کی محبت سے روکا گیا کہ ”انسان کہتا ہے میرا مال میرا مال، حالانکہ اس کا مال اتنا ہی ہے جتنا کہ اس نے اپنی زندگی میں کھا کر ختم کردیا، پہن کر پرانا کردیا اور جو راہ خدا میں خرچ کردیا اور اپنے لیے آخرت کا ذخیرہ کرلیا، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بندہ دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے اور خود یہاں سے رخصت ہونے والا ہے“ (معارف الحدیث)

مال اور دولت کے سلسلہ میں اس قسم کی تہدید اور مال کی محبت دلوں سے ختم کرنے کے لیے انفاق کے متعلق ترغیبات و ترہیبات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا مقصد سرمایہ کی چند مخصوص افراد میں تحدید سے بچا کر امت کے تمام افراد میں مساویانہ تقسیم ہے اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ خُذوا مِنْ اَغنیائِھِمْ وَرُدّوا اِلیٰ فُقرائِھِمْ کہ مال داروں سے وصول کر کے غربا میں تقسیم کر دو کہ اللہ کے مال سے صرف امرا ہی نہیں بلکہ غربا بھی مستفید ہوں

اسی نظام تقسیم دولت میں ایک نظام وقف کا ہے۔ جس میں دولت کے علاوہ جائیدادیں، زمینات اور مختلف قسم کی چیزیں ایک آدمی اللہ کے لیے وقف کر دیتا ہے، یہ وقف اُمت کے غریب طبقہ کیلئے نعمت عُظمیٰ ہے اور ان کے لیے تعلیمی ترقی اور معاشی استحکام کا بہترین ذریعہ ہے۔ ایک طرح سے غریب طبقہ کی تعمیر اور خوش حالی کا اہم سبب ہے۔ دراصل اللہ کا یہ ایک نظام ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں نواز دیتے ہیں اور ان کے ذریعہ اپنے دوسروں کی خدمت لے لیتے ہیں، جس طرح اسلام میں زکوٰۃ کا ایک مستقل شعبہ ہے اسی طرح وقف کا مستقل باب ہے جو وقف کے اصول اور اس کے ان بہترین مصارف کو بتاتا ہے جن میں اوقاف کے استعمال ہونے سے دین اسلام کے عظیم مقاصد پورے ہوتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وَقف پر کچھ تفصیلی روشنی ڈالی جائے جس سے واقف اور موقوف لہٗ کو سہولت ہو۔

"وقف کے لغوی معنی روکنے کے آتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں مفتیٰ بہٖ قول کے مطابق ایسے عمل کو کہتے ہیں کہ کوئی آدمی اپنی کسی چیز کو اللہ کی ملکیت میں اس طریقہ پر دیدے کہ اس کے ذریعہ اللہ کے بندوں کو نفع پہنچے، اس کے بعد واقف کی ملکیت ختم ہو کر اللہ کی ملک میں چلی جائے۔ اب وہ چیز نہ فروخت ہو سکتی ہے اور نہ ہی رہن رکھی جا سکتی ہے، نہ کوئی اس کے وارث ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے"

(المختصر المقدوری، کتاب الوقف ص ۱۵۸)

امام ابو حنیفہؒ و امام محمدؒ کے نزدیک وہ وقف نامکمل ہے جس کو ہمیشہ کے لیے وقف نہ کیا گیا ہو لایتم الوقف حتیٰ یجعلہ اٰخرہٗ بجھۃ لا تنقطع ابداً۔ کیونکہ وقف سے مقصود اس کو ہمیشہ کے لیے اللہ کی ملکیت میں رکھنا ہے۔ انتقال ملکیت کے متعلق قدوریؒ کتاب الوقف" میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے مسجد بنائی اور اس میں مالک کی اجازت سے ایک آدمی بھی نماز پڑھ لے تو یہ اس کے

وقف کرنے کی علامت ہے اس لیے ایک آدمی کے نماز پڑھتے ہی مالک کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ہے وقف کا طریقہ اور اس کا حکم ۔ یعنی وقف کرنے کے بعد فروخت و رہن کی اجازت ہی ہے نہ ہی اس کا کوئی وارث بن سکتا ہے بلکہ وہ جائیداد نسلاً بعد نسلٍ رفاہ عام کے لیے تا قیامت استعمال ہوتی رہے گی نہ اس کو کوئی قاضی یا حاکم فروخت کر سکتا ہے نہ اس کو کوئی وزارت یا محکمہ فروخت یا رہن رکھ سکتا ہے یہاں تک کہ اگر متولی یا کوئی ذمہ دار اس کو فروخت کرتا ہے یا کسی قسم کا تصرف کرتا ہے تو خائن اور غاصب سمجھا جائے گا اور ایسے متولی کو معزول کر دینا قاضی پر واجب ہے جیسا کہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ج ۵ ص ۲۴۲ پر درج ہے عبارت یوں ہے :

"اگر متولی میں خیانت ثابت ہو خواہ وہ واقف کا مقرر کیا ہوا ہو، یا قاضی کا یا عامۃ المسلمین کا اس کو معزول کر دینا واجب ہے قاضی پر یا عامۃ المسلمین پر ، لیکن اگر عامۃ المسلمین بذات خود اپنے اس اختیار شرع کو نافذ کرنے پر قادر نہ ہوں تو ان پر لازم ہے کہ حکام وقت سے استعانت کریں اور ان سے درخواست کر کے متولی صالح کو مقرر کرا کے وقف کے انتظام کی اصلاح کریں۔"

نیز فتاویٰ نظامیہ ج ۱ ص ۱۷۷ پر ایک استفتاء کے جواب میں درج ہے کہ

"موقوفات میں تصرفاتِ مذکورہ ہرگز جائز نہیں اور واقع ہونے کی صورت میں شرعاً باطل سمجھے جاتے ہیں اور متصرّف پر اس کا تاوان (جرمانہ) لازم آتا ہے ۔ متولّی تصرفات سے خائن و غاصب سمجھا جاتا ہے اور قاضی پر ایسے شخص کا معزول کرنا واجب ہے ، اور علیحدہ نہ کرنے کی صورت میں قاضی عند اللہ گنہگار ہوگا ۔"

اس فتویٰ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دین میں وقف کی کتنی اہمیت ہے اور اس میں تصرف پر شریعت کا کتنا سخت حکم ہے کہ متولی کو اگر قاضی معزول نہ کرے تو عند اللہ ماخوذ ہوگا ، گنہ گار ہوگا ۔ اس کے بعد ہم اوقاف اور ارباب اوقاف پر نظر ڈالیں تو شاید ہی کوئی متولّی اس سے مُنزّہ و مُبرّہ ہوگا ۔

اس کے بعد یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اوقاف کے مصارف کیا ہیں ؟ اور کون لوگ ہیں ؟ ۔ اور وقف بورڈ کہاں تک شریعت کے اس مطالبہ کی تکمیل کر رہا ہے ۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف کے مستحقین صرف محکمہ اوقاف کے عاملین و ملازمین ہی ہیں ۔ حالانکہ اوقاف کی آمدنی بے سہارا مطلقات

و بیوگان پر خرچ کرنی چاہیئے اور غریب و نادار لڑکیوں کی بیاہی کی ذمہ داری اسی سے عائد ہوتی ہے اور آئمہ مساجد و موذنین کی تنخواہیں اور ان کے مکان کی فراہمی، مدارس کا قیام، وقت ضرورت مسجدیں بنانا، غریب مسلم بچوں کی تعلیم کا نظم کرنا، مسافرین کی مدد کرنا، دینی طلبا کی مدد کرنا، اوقافی جائیدادوں کی حفاظت کرنا، یہ تمام تر ذمہ داریاں اوقاف پر عائد ہوتی ہیں، لیکن اس کے برعکس عام طور پر اور ہمیشہ اوقاف میں خسارہ کا ہی گلہ سننے میں آتا ہے۔ ایں چہ بوالعجمی است ! ان هذا الشئ عجاب.... جہاں محکمہ اوقاف کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اسلاف کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں سے غریب اخلاف کی کفالت کرے، اور جو اسلاف کا عین مقصد تھا، اب اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ اس غریب طبقہ کے حقوق سے محکمہ اوقاف کی پرورش ہوتی ہے۔

بزرگوں نے اس مقصد سے جائیدادیں وقف کی تھیں کہ غریب مسلمان اس سے فائدہ حاصل کریں ان کے بچے اس میں تعلیم حاصل کریں، مساجد کے لیے اس لیے وقف کی تھی کہ اس کے ذریعہ آئمہ و موذنین اور اس کے خادمین اپنا گزر بسر کریں۔ بڑی بڑی بلڈنگس اس لیے وقف کی تھیں کہ بے سہارا عورتیں اس کو اپنا سہارا بنالیں۔ مسافروں کے لیے مدد ہو سکے، دین کی خدمت ہو سکے لیکن آج محکمہ اوقاف کی غفلت ولاپرواہی سے کروڑ ہا روپیوں کی جائیدادوں پر غاصبین کا تسلط ہے۔

جو قبرستان بے رُوح انسانوں کی آبادی کے لیے وقف کیا گیا تھا آج اس پر ذی رُوح انسان آباد ہو رہے ہیں، جو قبرستان اُمت کی فلاح اور ان کی ہمدردی و سہولت کے لیے وقف کیا گیا تھا، آج ضمیر فروش انسان اس کی بیع و شرائے سے بھی گریز نہیں کر رہا ہے۔ حالانکہ مندرجہ بالا فتویٰ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موقوفہ جائیداد میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں۔ ہدایہ جلد اول ص ۶۲۰ پر درج ہے:۔ واذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه۔ یعنی جب شرائطِ وقف صحیح ہوں اور وقف مکمل ہو جائے تو اب اس کو فروخت کرنا یا اس پر ملکیت کا دعویٰ کرنا بالکل جائز نہیں۔

مساجد کی جائیدادیں بھی اسی کسمپرسی کی حالت میں ہیں کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں۔ مساجد کے تحت مکانات ہیں، دوکانات ہیں لیکن ان کا کرایہ آج بھی وہی ہے جو پچیس ۲۵ سال پہلے تھا جس کی وجہ سے لازماً آئمہ و موذنین کی حق تلفی ہوتی ہے لیکن کسی متولی کو، کسی محکمہ کو، کسی دانشور کو اس کا ادنیٰ سا احساس نہیں ہے، حالانکہ سلاطین ہوں کہ نواب صاحبان یا دیگر مخیر بزرگ حضرات ان کے وقف کا منشا یہی تھا

کہ مساجد کی جائیداد کے ذریعہ مساجد کے خادمین آسانی سے گزر بسر کرسکیں لیکن ان کی آمدنی سے محکمۂ اوقاف یا تو پورا پورا استفادہ نہیں کرتا یا اگر کرتا ہے تو مستحقین کو نظرانداز کرتا ہے، ان کی حق تلفی کرتا ہے حالانکہ یہ محکمہ اسلاف کی اوقافی جائیدادوں کا امین اور اس کا محافظ ہے اس کا متولّی ہے اور شرعی اعتبار سے یہ ہرگز جائز نہیں کہ ایک چیز کے لیے وقف کیا ہوا مال دوسروں کے لیے استعمال کیا جائے چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ص ۲۸۱ پر ایک استفتا کے جواب میں درج ہے :

"اوقاف مساجد کی آمدنی سے غسالہ کو یعنی جو کہ مردہ مستورات کو غسل دیوے، تنخواہ دینا جائز نہیں۔ متولی مسجد کو یہ اختیار نہیں کہ اوقاف مساجد کی فاضل آمدنی سے غسالہ وغیرہ کی تنخواہ میں صرف کرے۔"

مذکورہ بالا فتویٰ میں تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ فاضل آمدنی بھی دوسروں پر خرچ نہیں کرسکتے چہ جائیکہ اصل آمدنی خرچ کی جائے جس سے مستحقین کی حق تلفی ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے یہاں اوقاف کا طریقہ کار ہے .یہاں ہم کو محکمۂ اوقاف سے شکایت ہے وہیں امت مسلمہ سے سخت شکایت ہے کہ اپنی طاقت کے سہارے اپنے منصب کے ذریعہ اوقافی جائیدادوں کو پامال کیا جاتا ہے، کوڑی کے دام اس کو فروخت کیا جاتا ہے۔ ستم تو یہ ہے قبرستانوں کی قبروں کی حرمت کا ذرا پاس و لحاظ کیے بغیر منہدم کیا جاتا ہے اور بڑے فخر کے ساتھ اس پر مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں حالانکہ حدیث پاک میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے کہ ، **لا توطوا قبورکم او کما قال علیہ السلام** ۔ قبروں کو مت روندو، لیکن آج قبرستانوں کا حال یہ ہے کہ کہیں تو جانوروں کے اصطبل بنے ہوئے ہیں اور کہیں یہی انسانوں کے بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں۔ جو کل کو خود بھی اسی مقام پر دائمی پناہ لینے والے ہیں اور یہاں تک انسانیت مٹ چکی ہے کہ ملی قبرستانوں کی زمینات پر غاصب و قابض بھی ہیں اور قبروں کے لیے جگہ فروخت کی جاتی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے صحیح فرمایا : "بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو"۔ اور عدالتوں میں مقدمات بھی دائر کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ حدیث میں ہے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :۔

من اخذ بشبرٍ من الارض ظلماً فانہ یطوقہ یوم القیامۃ من سبع ارضین

جو کوئی کسی کی زمین بالشت بھر بھی ناحق چھین لے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ سات زمینوں کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالیں گے ۔ اور جھوٹے مقدمات کے متعلق بخاری شریف کی روایت میں ہے :۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :- میں بھی ایک عام آدمی ہوں اور تم لوگ میرے پاس اپنے مقدمات لے آتے ہو، ہو سکتا ہے کہ تمہارے فریق کے مقابلے میں تمہاری دلیل اچھی اور مضبوط ہو اور میں دلائل کے مطابق تمہارے حق میں فیصلہ کر دوں اور میں جس کے حق میں فیصلہ کر دوں وہ اپنے بھائی کا حق چھین رہا ہو تو وہ اس کو نہ لے (فلا یاخذو نہ) کیونکہ اس نے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اپنے لیے حاصل کر لیا ہے کہ جھوٹے دلائل حقیقت کے انداز میں پیش کر کے مقدمہ جیت گیا اور اپنے بھائی کا حق چھین لیا۔

آج جھوٹے مقدمات دائر کرنا، اوقافی جائیدادوں کو نقصان پہنچانا بڑا آسان ہو گیا ہے، اور اس میں محکمۂ اوقاف پر زبردست مالی بوجھ بنا ہوا ہے، یہ صرف اوقاف کو نقصان نہیں بلکہ پوری اُمتِ مُسلمہ کا نقصان ہے اور ان کے ساتھ کھلی غداری ہے اس لیے کہ محکمۂ اوقاف تو صرف امین ہے، محافظ ہے اور وہ جائیداد امت کے لیے وقف ہے گویا اس ایک غاصب کے مقابلے میں پوری اُمتِ مسلمہ فریق ہے، اور محکمۂ اوقاف اس کی وکیل ہے اس طرح سے اس کی حفاظت کی ذمہ داری صرف محکمۂ اوقاف پر نہیں، بلکہ پوری اُمتِ مُسلمہ خدا کے یہاں جواب دہ ہے اور ناحق چھین کر کھانے والے کے لیے قرآن میں بھی سخت وعید آئی ہے۔ یاایھاالذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقاً من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون (البقرۃ ۱۸۸) کہ اے ایمان والو! آپس میں ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال مت کھاؤ اور لوگوں کا مال گناہ کے ذریعہ ناجائز طریقہ پر کھانے کے لیے اس کے جھوٹے مقدمات بنا کر عدالت کے حکام کے پاس مت جاؤ

اوقافی جائیدادوں کی حفاظت کی ذمہ داری ازروئے شرع تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، جبکہ یہ جائیدادیں پوری امت کے استفادہ کے لیے وقف کی گئی ہیں اس لیے ان کا حق ہے اور ان پر فرض ہے کہ غاصبین کے قبضہ سے زمینات کو آزاد کرائیں اور ان کو امت کی فلاح، تعمیر و تعلیم و ترقی کے لیے اس کو استعمال کریں۔ امت کے اس فریضہ کے متعلق فتاویٰ دار العلوم دیوبند ص ۴۴۲ پر ایک استفتا کے جواب میں یہ فتویٰ تحریر ہے :-

"ایسی صورت میں (یعنی خائن فی الاموال الاوقاف ہونے کی صورت میں) زید قابل اور لائقِ تولیت نہیں ہے، اس کا معزول کرنا لازم ہے اور مسلمانوں کو وقف کی حفاظت

ضروری ہے۔ بشرط قدرت اس میں سکوت درست اور جس طرح ہوسکے وقف کی حفاظت کی کوشش کرنا ضروری ہے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح تحفظ شریعت مسلمانوں کا فریضہ ہے اور اس کے لیے ہر قسم کی کوشش کی جاسکتی ہے، اسی طرح شریعت کے اس جزُ کی حفاظت بھی ضروری ہے، ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ خیانت اور وقف کا تعلق چولی دامن کا سا ہوگیا ہے۔ حالانکہ خیانت فی نفسہٖ بُرا عمل ہے خواہ اس کی نسبت عام آدمی کی طرف ہو یا متعلقہ عہدہ دار کی طرف، بلکہ دوسری صورت میں اور بھی زیادہ جرم ہوجاتا ہے، اور بالخصوص اس امانت میں خیانت انتہائی مذموم اور دنیا و آخرت میں وبال جان ہے۔ جب کہ اس امانت کا تعلق صرف ایک آدمی سے نہیں بلکہ پوری قوم اور متعدد افراد سے ہو، اس سلسلہ میں "عہد نبوی" کا ایک واقعہ قابل عبرت ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن میں آل عمران کی آیت نمبر ۱۶۱ کے ذیل میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک غزوہ میں ایک شخص نے اُون کا کچھ حصہ چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ مال غنیمت تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ آپؐ نے باوجود رحمت اللعالمین ہونے اور اُمت پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہونے کے اس کو یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اب میں اس کو کس طرح لشکر میں تقسیم کردوں، اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہوگے۔

اس لیے غلول کی سزا بھی عام چوریوں سے زیادہ اشد ہے، میدان حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی، سب کے سامنے اس کو اس طرح رُسوا کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر لدا ہوا ہوگا۔ صحیحین کی روایت کے مطابق جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :۔ "دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مال غنیمت کا اونٹ چرایا تھا، وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکم الٰہی پہنچا دیا تھا اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔—"

اس کے آگے حضرت مفتی شفیع علیہ الرحمۃ نے " اموال اوقاف اور سرکاری خزانہ میں چوری بحکم غلول ہے" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ : یہی حال ہے مساجد، مدارس، خانقاہوں اور اوقاف کے اموال کا، جس میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے۔ اگر معاف بھی کرائے تو کس کس سے کرائے ؟ اسی طرح

حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے کیونکہ اس میں پورے ملک کے باشندوں کا حق ہوتا ہے، جو اس میں چوری کرے اس نے سب کی چوری کی، مگر چونکہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگران کار بے پروائی کرتے ہیں، چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں، اس لیے آجکل دنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہورہی ہے۔ اوقاف کے جو مسائل ہیں، اسی میں اہم اور پیچیدہ مسئلہ وقف کی غیر اسلامی تولیت کا ہے، جیسا کہ اکثر اوقاف کی جائیدادیں غیر اسلامی تولیت کی زیر نگرانی ہیں۔

وقف اور عاملین کی خدمات و تنخواہیں،
خدمت سے سبکدوشی پر وظیفہ کی اجرائی،

یہ مسائل بھی وقف بورڈ کے لئے قابل غور ہیں، ان میں سے "خدمات" کا مسئلہ ہی وقف بورڈ کیلئے دردسر بنا ہوا ہے اور بورڈ کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے جس کے بارے میں وقف سے متعلق ہر فرد بلکہ منصب صدارت اور اس سے آگے منصب وزارت کو بھی سخت شکایت ہے، جن کا کئی مرتبہ اظہار بھی ہوا ہے اور ہر کوئی شخص اس کو دیکھ سکتا ہے کہ مساجد کی کمیٹیوں کی طرف سے بورڈ کو خطوط لکھے جاتے ہیں لیکن ان کے جوابات ہی نہ دارد، اور کوئی حکم نامہ یا ہدایت نامہ آتا ہے تو انسپکٹر کے دفتر سے آتا ہے جب کہ وہ اس کا مجاز نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ معاملہ ہوتا ہے کہ انسپکٹر صاحب خود اپنے چند متعارفین کو جو اُن کے ہمنوا ہوتے ہیں، ان سے مشورہ کرکے وقف کمیٹی بنا دیتے ہیں اور اس کے اراکین کو بھی بقلم خود نامزد کرتے ہیں، اب وہ کمیٹی بلا توثیق و بغیر علم وقف بورڈ مشہور ہوجاتی ہے، اس قسم کی بہت سی شکایتیں ہیں ان کا دور کرنا ضروری ہے اور جہاں وقف فنڈ کی وصولی کا موقع ہوتا ہے تو انسپکٹر صاحب پہنچ جاتے ہیں اور تاخیر ہو تو دھمکیاں بھی دیتے ہیں لیکن جہاں بیرویوں کا مسئلہ آتا ہے اور قبرستانوں کے تحفظ کا مسئلہ آتا ہے، اس کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی حالانکہ محافظین وقف کے ایک ذمہ دار رکن ہوتے ہیں اور اکثر مقامات پر وقف فنڈ وصولی کا بھی نظم نہیں ہے، جس سے بورڈ کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شکایات کے دور نہ ہونے سے وقف بورڈ عوام کے اعتماد سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے جب کہ اس کو عوامی اعتماد کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے جب تک دفتری نظام خدمت کی اصلاح نہ ہو اس وقت تک مسائل جوں کے توں رہیں گے اور اس اصلاح سے وقف بورڈ ایک اہم

گھاٹی کو عبور کرے گا، اسی سے ان کی تنخواہوں کو معقول بھی بنایا جا سکتا ہے اور تنخواہوں کی شکایت بھی دور ہو سکتی ہے۔ عام طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وقف بورڈ کے ملازمین کو خدمت سے سبکدوشی پر وظیفہ دیا جانا چاہیئے، خواہ اس ملازم کا تعلق بورڈ کے دفتر سے ہو یا مسجد کی کسی خدمت سے ہو۔ واضح رہے کہ وظیفہ کی اجرائی کے لیے شریعت میں کسی بھی قسم کا جواز نہیں ہے اس لیے کہ وہ ایک خیراتی ادارہ ہے اور وقف کا تعلق صرف خدمت سے ہے کہ جب تک خدمت کیا اُجرت لے لیا۔ اس کے بعد اس کو اجرت لینا جائز نہیں، ہاں اگر وقف کرنے والے نے یہ وضاحت کی ہو کہ خدمت سے سبکدوشی کے بعد خادم کو اس سے بطور وظیفہ کچھ رقم دی جا سکتی ہے۔ تب درست ہے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد پنجم ص ۴۴۲ پر ایک استفتا کے جواب میں درج ہے کہ "مال وقف سے پنشن دینا بدون شرط واقف درست نہیں۔"

وقف بورڈ — مشورے — تجاویز

وقف بورڈ مسلمانوں کا شرعاً نمائندہ ادارہ اور قانوناً سرکاری ادارہ ہے، وہ کئی اہمیتوں کا حامل ہے، وہ اسلاف کی جائیدادوں کا محافظ و امین ہے اور من وجہ اختلاف مسلمانوں کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود کا ضامن ہے، قوم کی اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ عندالناس بھی جواب دہ ہے، حکومت بھی باز پرس کر سکتی ہے اور عنداللہ بھی ماخوذ و مامور ہے۔ اس پر تنقیدیں بھی ہوتی ہیں، تائیدیں بھی ہوتی ہیں، چونکہ موجودہ وقف بورڈ میں بہت سے پیچیدہ مسائل ہیں لیکن بظاہر اس کی ذمہ داری تھوڑی معلوم ہوتی ہے لیکن جب طوق اوقاف گلے میں ڈالا جاتا ہے تو اس وقت انتظامیہ کو محسوس ہوتا ہے اور یہ شعر اسی حالت پر صادق آتا ہے ؎

مصحفی ہم تو سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ٭٭ دل میں تیرے بہت کام رفو کا نکلا

چونکہ روز ازل ہی سے وقف بورڈ میں فاسد نظام کی جڑیں پھیل رہی ہیں جو اب بہت پختہ ہو چکی ہیں اور عوام بھی اس کی دینی و شرعی اہمیت سے بالکل ناواقف ہے۔ غاصبین و قابضین کے پاس کوئی بڑی چیز نہیں رہی اس لیے اس نظام کی اصلاح کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اقدام سے قبل اوقاف کو ۴ زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ دفتری نظام کی اصلاح
۲۔ اوقاف کے متعلق عوامی شعور کو بیدار کرنا
۳۔ اوقافی جائیدادوں کو غاصبین کے تسلط سے آزاد کرانا
۴۔ اوقاف کا صحیح مصرف میں صرف کرنا

جہاں تک دفتری نظام کی اصلاح کی بات ہے یہ انتہائی ضروری ہے اس کی اصلاح وقف بورڈ کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اس کی اصلاح کے لیے بورڈ کے اراکین میں سے کسی ہمدرد اور فعّال رکن کو اس کا ذمہ دار بنایا جائے۔ وہ اس نظام کی نگرانی و اصلاح کرے اور اس کی سفارش پر کسی ملازم کی ترقی و تنزّلی و عزل و نصب کو موقوف رکھا جائے اور ہر تین ماہ پر دفتری نظام کی رپورٹ صدر وقف بورڈ کو پیش کیا کرے۔ اس نظم سے دفتری نظام میں جلد بہتری آسکتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسی انداز پر ضلعی دفاتر کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔

اس اصلاح کے لیے عوامی شعور بیدار کرنا ضروری ہے۔ اب تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہر سطح سے انفرادی و اجتماعی اپیل وقف بورڈ کے تعاون کے لیے کی گئیں لیکن غاصبین کو اس سے کسی قسم کی جنبش نہیں ہوئی بلکہ غاصبین کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، نہ ہی کوئی تعاون بورڈ کو حاصل ہوا۔ اس کے لیے زبردست طاقت کی ضرورت ہے جو قوم کے دلوں کو گرما دے اور ان کے دلوں میں غاصبین کے خلاف شعلے بھڑکائے، یہ کام علمأ سے ہی ممکن ہے، چونکہ عوام پر علما کی گرفت ہوتی ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے علماء پر عوام کو اعتماد بھی حاصل ہے جو کسی قوم کی ترقی کا راز ہے۔ ہمارے لیے حالیہ تحریک تحفظ شریعت روشن مثال ہے۔ علمأ کے بجائے دوسرے افراد شاید اس میں کامیاب نہ ہوئے جب کہ علما کی آواز پر قوم نے لبیک کہا اور اپنی صدائے احتجاج سے پارلیمنٹ کی دیواریں دہلادیا، اور حکومت کو مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اسی طرح مجلس تحفظ اوقاف کے نام سے ایک کمیٹی بنائی جائے، جس میں فعال اور بااثر علماء کو ذمہ دار بنایا جائے اس مجلس کے ذریعہ ساری ریاست میں "تحفظ اوقاف تحریک" چلایا جائے، ہر جگہ جلسے کیے جائیں اور ہر جگہ مجلس تحفظ اوقاف قائم کی جائے اور اس میں ہمدرد اور بااثر نمائندوں کو لیا جائے اور علمأ سے تعاون حاصل کیا جائے۔ انشاء اللہ یہ تحریک مفید اور ثمر آور ثابت ہوگی۔

اوقاف کی مقبوضہ جائیدادوں کو آزاد کرانا ایک کٹھن مسئلہ بنا ہوا ہے۔ تصفیہ کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے اور قانونی امداد بھی چاہیئے، جو زر کثیر کا طالب ہے، پھر بھی کامیابی کی پوری توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہاں کی عدالتوں سے فیصلہ حاصل کرنے کے لیے کسی دانشور کے قول کے مطابق تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمر نوح، صبر ایوب، خزانۂ قارون۔ اس مقولہ میں اگر غلو ہو تو مطلق

بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عدالتوں کے مقدمات میں کامیابی کے لیے حکومت سے مطالبہ کیا جائے جیسا کہ خود وزیر قانون نے سرکل وقف کمیٹیوں کی کانفرنس میں تعاون کا وعدہ کیا ہے، مطالبہ یہ ہو کہ چونکہ اوقاف کے مقدمات بہت زیادہ ہیں اور مقدمات کی عدالتوں میں یکسوئی کے لیے طویل وقت بورڈ کی ترقی میں غیر معاون ثابت ہوتا ہے اس لیے موقتی عدالتیں قائم کی جائیں، جس کو جدید اصطلاح میں لوک ایوکت عدالت کہا جاتا ہے، اور بلا تاخیر فیصلے کیے جائیں۔ اس کے علاوہ ایک مجلس وکلا قائم کی جائے، جس میں امت کے ہمدرد وکلا سے درخواست کی جائے کہ وہ فلاح اُمت کی خاطر وقف بورڈ کو اپنا مفت تعاون دیں۔ اس طرح سے عدالت کے مسائل سے بہت جلد یکسوئی ہوسکتی ہے اس کے ساتھ ساتھ محکمۂ پولیس و بلدیہ سے درخواست کی جائے کہ ہر وقت وقف بورڈ کو تعاون دیں اور ان کے ساتھ ضرورت پڑنے پر اجنبیانہ اور تاجرانہ سلوک نہ کیا جائے۔

آخری مرحلہ میں وقف بورڈ میں اعلیٰ سطح پر ایک مشیر شرعی کا تقرر کیا جائے جو جدید فقہ بالخصوص وقف پر عبور رکھتا ہو، چونکہ یہ ادارہ جہاں سرکاری ہے وہیں مذہبی بھی ہے اس سے یہ سہولت ہوسکتی ہے کہ وقف کا مذہبی لحاظ سے صحیح استعمال ہوگا۔ اس طرح وقف بورڈ مذہبی و سرکاری لحاظ سے ترقی کرسکتا ہے، اور اس کے مقاصد میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ اور وہ ایک نیک نام، مثالی اور قوم کے حق میں مفید و کار آمد ادارہ ہوسکتا ہے اور اس سے حکومت کا وقار بھی اقلیتوں کے دلوں میں پیدا ہوگا۔

نیز یہ بھی قابل توجہ مسئلہ ہے کہ آئے دن اخبارات میں صدر نشین وقف بورڈ کی معزولی کی صدائیں گونجتی رہتی ہیں اور یہ آوازیں اعلیٰ سطح پر بھی گونجتی رہتی ہیں اس سے قومی شعور کے اضمحلال کا پتہ چلتا ہے کہ یہ سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہے کہ کیا صرف کسی عہدیدار کی تبدیلی سے تمام محکمہ پورا ادارہ درست ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کو اگر ناممکن نہیں کہا جاسکتا تو محال ضرور کہا جائے گا۔ کسی شاعر نے بہت صحیح کہا ہے

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو بدلیں چلن اپنا
محض ساقی بدل جانے سے میخانہ نہیں بدلتا

اقلیت کے حقوق اور اسلام

سید حسنین احمد ندوی
فاضل دیوبند

اقلیت عصرِ حاضر کی ایک جدید اصطلاح ہے، جس کی تعریف ماہرین عمرانیات نے اس طرح کی ہے :-

"یہ اشخاص کا ایسا گروہ ہے، جو ایک ہی سماج میں دوسروں سے نسلی قومیت، مذہب یا زبان کی بنیاد پر مختلف ہو، جو نہ صرف اپنے کو مختلف و ممیز گروہ سمجھتا ہو، بلکہ دوسرے بھی اسے مختلف گروہ سمجھتے ہوں"(۱)

اقلیتی گروہ چونکہ نسبتاً طاقت سے محروم ہوتا ہے، اسلئے برسرِ اقتدار طبقہ یا اکثریتی گروہ اس کے ساتھ مختلف طریقہ سے امتیازی برتاؤ کرتا ہے، اقلیتوں کے ساتھ کیا جانے والا امتیازی سلوک آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہر جگہ معمولی تفاوت کے ساتھ موجود ہے، جب کہ ایک طرف دنیا بنیادی حقوق :- Fundamental Rights بنیادی انسانی حقوق Basic Human Rights، اور انسان کے پیدائشی حقوق Birth Right of Man، کے نعروں سے گونج رہی ہے تو دوسری طرف اقوامِ متحدہ کی طرف سے عالمی منشور کی ہر طرف دھوم مچی ہے اور اسے عصرِ جدید کے انسانوں کا عظیم کارنامہ تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود حال یہ ہے کہ دنیا کے عظیم دستوری ممالک جیسے امریکہ، برطانیہ، فرانس، نیوزی لینڈ اور بھارت میں بھی اب تک لوگوں کو تمام بنیادی حقوق حاصل نہیں ہو سکے ہیں اور وہ افراد جن کا تعلق اقلیت سے ہے ان کے ساتھ کہیں رنگ، کہیں مذہب اور کہیں زبان کے نام پر بدترین امتیازی سلوک روا

رکھا گیا ہے، اس المیہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ اور نگرانی کا کام ملکی دساتیر کا جس کی خود کوئی مستقل حیثیت نہیں اور نہ ہی یہ تغیر و تنسیخ سے محفوظ ہوتا ہے، اسلئے کہ یہ دساتیر سیاست دانوں کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو اپنی پارٹی کے نظریات و رجحانات سے وفاداری کے پابند ہوتے ہیں، اس کے علاوہ بعض اوقات مخلوط حکومتوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں کی رعایت بھی ان کے پیش نظر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی ملک کا دستور وہاں کے باشندوں کے بنیادی حقوق کا محافظ اور نگراں ہونے کے بجائے حکمراں پارٹی کے مفادات کا محافظ اور ان کے ظالمانہ اقدامات کا پشت پناہ بن جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے سی ڈی کرنگ لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک بیسویں صدی میں بنیادی حقوق کے تحفظ کا سوال ہے خود عوام کے منتخب نمائندوں نے اس سلسلے میں اپنے آپ کو ناقابلِ اعتماد ثابت کر دیا ہے، عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ اکثریتی پارٹیوں نے نہ صرف دستور میں دئے گئے حقوق کو تبدیل کر ڈالا، بلکہ پورا دستور ہی بدل کر رکھ دیا۔"(۲)

یہی حال اقوامِ متحدہ کے منشورِ آزادی کا ہے، اس کی کوئی مستقل قانونی حیثیت نہیں ہے، رضاکارانہ طور پر اگر کوئی ملک چاہے تو اس پر عمل کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو ردی کی ٹوکری کے نذر کر دے، اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتی۔

"خالص قانونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو منشور کی دفعات کسی بھی رکنِ ملک پر انہیں تسلیم کرنے اور منشور کے مسودہ یا اس کے ابتدائیہ میں صراحت کردہ انسانی حقوق اور آزادیوں کو تحفظ دینے کی پابندی عائد نہیں کرتیں، منشور کی زبان میں کسی ایسی تعبیر کی گنجائش نہیں جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ رکن ممالک اپنے شہریوں کو انسانی حقوق اور آزادیاں دینے کے لئے قانونی طور پر پابند ہیں۔"(۳)

"منشور نے کسی فرد کو یہ قانونی حق نہیں دیا ہے کہ وہ منشور میں دئے گئے

حقوق اور آزادیوں میں سے کسی ایک کے سلب ہو جانے کی صورت میں بین الاقوامی عدالت یا اقوام متحدہ کے سب سے بڑے ادارہ انصاف میں اپیل کر سکے۔[4]

اس کے برعکس اسلام نے اقلیتوں کو جو حقوق عطا کئے ہیں، وہ مستقل اور ناقابلِ تنسیخ ہیں، حاکمِ وقت کی ذمہ داری صرف اس کے تنفیذ کی ہوگی، اس میں تغیر و تبدل کا وہ مجاز نہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی حاکمِ وقت نے اپنی ذاتی رائے یا مفاد کے تحت ان عطا کردہ حقوق کی خلاف ورزی کی تو علماء نے اس کی شدید مخالفت کی اور تلافی کا حکم دیا، تاریخ اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

۱۶۹ھ میں خلیفہ ہادی کے زمانہ میں جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر بنا تو اس نے مصر کے کئی گرجوں کو منہدم کرا دیا جس میں حضرت مریم کا مشہور گرجہ بھی تھا، اس واقعہ کے ایک سال کے بعد جب ہارون الرشید خلیفہ بنا تو اس نے علی بن سلیمان کو معزول کر کے موسیٰ بن علیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا، موسیٰ نے گرجوں سے متعلق علماء سے استفسار کیا، اس وقت مصر کے سب سے بڑے عالم اور محدث حضرت لیث بن سعد نے فتویٰ دیا کہ منہدم گرجے نئے سرے سے تعمیر کرا دئے جائیں، چنانچہ سرکاری خزانے سے ان تمام گرجوں کی تعمیر کی گئی۔[5]

یوحنا نام کا مشہور گرجا دمشق کی جامع مسجد سے متصل تھا، حضرت امیر معاویہؓ نے مسجد کی توسیع کے پیشِ نظر چاہا کہ عیسائیوں کی رضامندی سے گرجا کو مسجد میں شامل کر دیں، لیکن عیسائیوں نے انکار کر دیا اور حضرت امیر معاویہؓ یہ کام نہ کر سکے، عبد الملک بن مروان نے اپنے عہد میں عیسائیوں سے پھر درخواست کی اور ایک بڑی رقم کی پیشکش کی، لیکن عیسائی بدستور اپنے انکار پر قائم رہے، ولید بن عبد الملک نے اپنے زمانہ اس سلسلہ میں ایک بڑی رقم عیسائیوں کو پیش کی، لیکن انہوں نے نامنظور کر دیا، اس پر ولید نے غصہ میں آکر کہا کہ اگر تم خوشی سے دینے کے لئے تیار نہ ہوئے تو میں جبراً لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے گرجا کو منہدم کرا کے مسجد میں شامل کرا دیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے

زمانہ میں عیسائیوں نے اس کی شکایت ان سے کی، آپؒ نے دمشق کے عامل کو لکھا کہ گرجا کا وہ حصہ جو منہدم کر کے مسجد میں شامل کر دیا گیا ہے عیسائیوں کے حوالے کر دیا جائے، مسلمانوں کو اس پر بہت رنج ہوا اور کوئی چارہ نہ پا کر وہ عیسائیوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اگر تم مسجد کے اس حصہ کو ڈھانے سے باز آجاؤ تو تمہیں غوطۂ دمشق کے وہ تمام گرجے جو مسلمانوں کے قبضے میں ہیں واپس کر دیے جائیں گے، عیسائی اس پر راضی ہو گئے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے غوطۂ دمشق کے گرجے عیسائیوں کو واپس دلوا دیے اور مسجد کے انہدام کا حکم نامہ منسوخ کر دیا۔[۶]

مذہبی حقوق:

اسلام اپنے دائرۂ سلطنت میں بسنے والے ہر شخص کو بلا کسی امتیاز مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، وہ اس سلسلہ میں کسی جبر و اکراہ کو پسند نہیں کرتا: لا اکراہ فی الدین دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"اللہ نے ایمان کے معاملے میں جبر و زبردستی کو دخل نہیں دیا ہے بلکہ اسے تمکن و اختیار پر چھوڑ دیا ہے، اسی مفہوم کو یہ ارشاد بھی واضح کرتا ہے:

"اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام روئے زمین کے باشندے ایمان لے آتے کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں؟" اگر اللہ کی مصلحت یہی ہوتی کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے، تو وہ خود ہی لوگوں کو ایمان پر مجبور کر دیتا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور سارا معاملہ لوگوں کے اختیار پر چھوڑا۔"[۷]

۹ھ میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ نجران کے ساتھ تحریری معاہدہ کیا تو اس میں وضاحت فرما دی:

"نجران اور ان کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا مذہب،

ان کا مال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے قاصد، ان کی مورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسولؐ کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی فرق یا تغیر نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کے حقوق میں دست درازی کی جائے گی اور نہ مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت سے اور نہ کوئی راہب اپنی رہبانیت سے ہٹایا جائے گا اور جو بھی کم زیادہ ان کے قبضے میں ہے اسی طرح رہیگا۔"(۸)

چنانچہ خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں جتنے بھی معاہدات کئے، ان تمام میں اقلیتوں کے مذہبی حقوق کو مدنظر رکھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے حیرہ فتح کیا تو یہ معاہدہ لکھا:

"نہ ان کے گرجے برباد کئے جائیں گے، نہ انہیں ناقوس بجانے سے منع کیا جائے گا، اور نہ عید کے دن صلیب نکالنے سے روکا جائے گا۔"(۹)

بیت المقدس کا وہ تاریخی معاہدہ، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں تحریر کیا گیا یہ تھا:۔

"یہ وہ امان ہے جو اللہ کا بندہ امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا والوں کو دیا یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام فرقوں کے لئے ہے، اس طرح کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائیگی نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ اس کے احاطہ میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ مذہب سے متعلق ان پر جبر کیا جائے گا۔"(۱۰)

اسلام نے عقیدہ و مذہب کی آزادی کا اس حد تک لحاظ کیا ہے کہ اگر کسی مسلم کی بیوی اہل کتاب ہو اور وہ اپنے عبادت خانہ کو جانا چاہے تو مسلم شوہر کو اسے روکنے کا حق نہ ہوگا۔(۱۱) اس کا نتیجہ تھا کہ بعض ایسے فرقے جنہیں علیحدہ مذہب ہونے کی وجہ سے کہیں پناہ نہ مل سکی، ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور وہ ادھر ادھر مارے پھرے، اسلام کے زیر سایہ انہیں امن و سکون نصیب ہوا اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہے۔

"سلطنت کسریٰ کے اخیر عہد میں مانی نام کے ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور چند کتابیں بطور وحی کے پیش کیں، ایران میں تیزی سے مذہب پھیلنے لگا، حاکمِ وقت نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو مانی کو طلب کر کے قتل کرا دیا اور یہ حکم دیا کہ مانی مذہب کے تمام پیرو کار قتل کر دیے جائیں، بڑی تعداد میں لوگ قتل ہوئے اور بہت سے بھاگ نکلے، یہ لوگ ایک عرصہ تک جانی مذہب کے تحفظ کی خاطر مختلف علاقوں میں مارے مارے پھرتے رہے یہاں تک کہ جب اسلام کا عہد آیا تو یہ لوگ عراق میں بس گئے اور اس طرح انہیں سکون نصیب ہوا۔"(۱۲)

اسلام کے اقلیتوں کو دیے ہوئے یہ حقوق جمہوری ممالک کی طرح صرف رسمی اور کاغذی نہیں بلکہ واقعی اور عملی ہیں، چنانچہ اسلامی سلطنت میں یہ ہمیشہ نافذ رہا اور اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوئی، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک مستشرق مصنف مانٹ گومری واٹ نے لکھا:

"رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جتنے معاہدات ہوئے ان سب میں واضح طور پر اس امر کی ضمانت دی گئی کہ ہر اقلیت کو اپنے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ اور یہ آزادی بعد کے زمانہ میں بھی باقی رہی، عیسائیوں کے چرچ اور یہودیوں کے صومعے محفوظ رہے، بعد میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ انہیں نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جائے مگر اقلیت کے بارے میں اس قسم کے دوسرے نئے قوانین پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔"(۱۳)

جان و مال کا تحفظ:

زندگی کے تحفظ کی ضمانت انسان کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے، وہ معاشرہ جو اس قسم کی ضمانت سے خالی ہو کبھی انسانی معاشرہ نہیں بن سکتا، اور نہ ہی وہاں تہذیب و

تمدن اور اعلیٰ انسانی اقدار کا درخت برگ و بار لا سکتا ہے، انسانی زندگی کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اسلام نے ایک انسان کی موت کو سارے عالمِ انسانیت کی موت کے مترادف قرار دیا ہے اور ایک شخص کی زندگی کے تحفظ کو تمام انسانوں کی زندگی کا تحفظ قرار دیا ہے۔

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکأنما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیاء الناس جمیعاہ (مائدہ ۳۲)

جس نے کسی انسان کو قصاص یا فساد فی الارض کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

اسلام نے انسانی زندگی کو جو غیر معمولی اہمیت دی ہے اس میں بحیثیت انسان سب برابر ہیں اور اس کا اطلاق مملکتِ اسلامی میں رہنے والی اقلیتوں پر بھی اسی طرح ہو گا، جس طرح کہ ایک مسلم پر، کیونکہ اسلام انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکمہ (حجرات ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، یہ جماعتیں اور گروہ تو تعارف کے لئے ہیں، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بہتر متقی و پرہیزگار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

(۱) تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں۔[۱۴]

(۲) میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔[۱۵]

اس طرح اسلام نے ایک مسلم اور غیر مسلم دونوں کے خون کو مساوی قرار دیا، اور اس میں کوئی تفریق نہیں کی اور اس پر تاریخ کے ہر دور میں عمل ہوتا رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلم نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؓ نے یہ تحریری حکم بھیجا: "کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے" چنانچہ قاتل مقتول کے وارثین کے سپرد کر دیا گیا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔[۱۶]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل فیروز عرف لولو، مجوسی النسل عیسائی تھا، حضرت عمرؓ کے بڑے بیٹے عبید اللہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ کچھ اور لوگ بھی اس سازش میں شریک تھے تو وہ تلوار ہاتھ میں لے کر نکلے اور فیروز کے بیٹے جفینہ اور ہرمزان کو قتل کر دیا جن پر سازش کا شبہہ تھا، عبید اللہ اسی وقت گرفتار کرلئے گئے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو پہلا مسئلہ یہی پیش ہوا کہ عبید اللہ کے متعلق کیا کیا جائے؟ حضرت عثمان غنیؓ نے اکابر صحابہؓ سے رائے طلب کی، سبھوں نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ عبید اللہ کو قتل کر دیا جائے۔[۱۷]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تو آپ نے بھی یہ حکم دیا کہ قاتل مسلمان ذمی مقتول کے بدلے قتل کر دیا جائے۔[۱۸]

حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد میں بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا، آپ نے بھی یہی حکم دیا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے، چنانچہ وارثوں نے قاتل کو قتل کر دیا۔[۱۹]

اس طرح اسلامی فقہ کا یہ مسئلہ بن گیا کہ اگر کوئی مسلم سلطنتِ اسلامی کے کسی غیر مسلم باشندے کو قتل کر دے تو بطور قصاص اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

ویقتل المسلم بالذمی[۲۰] — ذمی کے بدلے مسلم کو قتل کیا جائے گا۔

اسلام اقلیتوں کو جان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ مال و جائیداد کے تحفظ کا حق بھی عطا کرتا ہے، یہاں تک کہ حاکمِ وقت بھی اس بات کا مجاز نہیں ہوتا کہ وہ اقلیت سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو ان کے مال یا جائیداد سے محروم کر دے۔

"امام وقت کو بھی اس بات کا اختیار نہ ہو گا کہ وہ ان سے زمین لے لے، کیوں کہ یہ زمین ان کی ملکیت ہے، جو ان میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہیگی، اور وہ اس کو مزید فروخت کرنے کے بھی مجاز ہوں گے۔"[۲۱]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے

پالنے کے لئے ایک رمنہ بنانے کی اجازت چاہی، آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو جو بصری کے گورنر تھے لکھ بھیجا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دیدی جائے[۲۲]۔

شام کے ایک کاشتکار نے شکایت کی کہ ان کی زراعت کو اہلِ فوج نے پامال کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے بطور تاوان دس ہزار درہم اس کو دلوائے[۲۳]۔

سیاسی و معاشی حقوق:

اقلیتوں کو اسلامی ریاست میں وہ تمام سیاسی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمان شہری کو حاصل ہوتے ہیں، البتہ سلطنت کے چند کلیدی عہدے جیسے صدارت مملکت وزارتِ عظمیٰ، وزارت داخلہ وغیرہ انہیں نہیں مل سکیں گے، کیونکہ غیر مسلم اسلامی مملکت کے بنیادی دستور قرآن و حدیث کے وفادار نہیں ہوتے، جب کہ ان عہدوں کے لئے ایمان اور قرآن و حدیث سے مکمل وفاداری شرط کا درجہ رکھتا ہے، ان چند عہدوں کے علاوہ تمام عہدوں پر غیر مسلم اقلیت کا تقرر عمل میں لایا جا سکتا ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں دفاتر اور فوج میں ایک بڑی تعداد غیر مسلم اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد کی تھی، جس میں ایرانی، رومی، یونانی اور ہندوستانی شامل تھے[۲۴]۔

خراج اور مالگذاری کے محکمہ میں تمام اسلامی ممالک میں اکثریت غیر مسلم اقلیت کی تھی، یہاں تک کہ ۸۱ھ تک ان دفاتر کی زبان بھی ان میں کام کرنے والے اقلیت کی زبان تھی جیسے قبطی، لاطینی، فارسی وغیرہ، اس کے علاوہ ملکی نظم ونسق کے چلانے میں بھی اقلیتوں سے مشورہ لیا کرتے تھے، اسی طرح آپ مصر کے جملہ انتظامات میں وہاں کے سابق حکمراں مقوقس سے مشورہ لیتے تھے۔

اسلام نے اقلیتوں کو جو حقوق دئے ہیں یہ اس کا ایک سرسری جائزہ تھا، لیکن

اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے صدیوں پہلے اقلیتوں کو حقوق ادا کر دیے ہیں، انسانی قانون کو وہاں تک پہونچنے میں ابھی اور کئی صدیاں لگیں گی۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) فرہنگ سیاسیات ص۶۴

(۲) Marxism Communism and Western Socity

(۳) The Law of united Nations ص۲۹

(۴) Diagonosis of our Tim ص۱۵

(۵) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقریزی ص۱۱۵ ج ۲۔

(۶) فتوح البلدان ص۱۲۵

(۷) کشاف ص۱۱۹ ج ۱

(۸) فتوح البلدان ص۶۵

(۹) کتاب الخراج ص۸۴

(۱۰) طبری (فتح بیت المقدس)

(۱۱) فقہ السنۃ ص ج ۲

(۱۲) کتاب الفہرست ص۳۳۷

(۱۳) The Majesty That Was Eslam

(۱۴) بخاری۔ مسلم۔

(۱۵) ابوداؤد (کتاب الصلوٰۃ)۔

(۱۶) الدرایہ فی تخریج الہدایہ ص۳۶۰۔

(۱۷) مسعودی کتاب الاوائل۔

(۱۸) زیلعی ص۲۸۔

(۱۹) ایضاً

(۲۰) فتاویٰ عالمگیری ص۱۷۵ ج ۴۔

(۲۱) کتاب الخراج ص۱۵۔

(۲۲) فتوح البلدان ص۳۵۱۔

(۲۳) کتاب الخراج ص۸۲۔

(۲۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الفاروق ص۳۳۵"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں

خالد حسین صدیقی

آپؐ کی بہت ساری خصوصیتوں اور معجزوں میں سے ایک اہم ترین خصوصیت اور معجزہ آپؐ کی پیشین گوئی اور اس کا حرف بحرف درست ہونا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دو نہیں بلکہ بیشمار ایسے واقعات کتب احادیث میں آئے ہیں، جن سے مذکورہ دعویٰ کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے، ذیل کی سطروں میں ہم انہیں میں سے چند واقعہ کا ذکر کریں گے:

حضرت ام کلثوم فرماتی ہیں کہ جب نبی کریمؐ نے ام سلمہؓ سے شادی کی تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے نجاشی بادشاہ کے پاس مشک کے چند اوقیہ اور زیور بھیجے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ وہ مرچکا ہے، اور ہدیہ کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ وہ پھر میرے پاس لوٹا دیا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپؐ نے فرمایا، یعنی نجاشی مرگیا اور ہدیہ کے آپؐ کے پاس لوٹا دیا گیا[۱]۔

اسی مضمون کی ایک روایت کو امام بخاریؒ نے بھی نقل فرمایا ہے، راوی حضرت انسؓ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت ابن رواحہؓ کی شہادت کے بارے میں (موتہ سے) خبر آنے سے پہلے ہی لوگوں کو بتلادیا، حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (جنگ میں) پہلے حضرت زیدؓ نے علم سنبھالا، اور وہ شہید کر دیئے گئے، پھر حضرت جعفرؓ نے علم سنبھالا وہ بھی شہید کر دیئے گئے، پھر حضرت ابن رواحہؓ نے علم سنبھالا، بالآخر وہ بھی شہید کر دیئے گئے[۲]۔

ایسے بھی واقعات پیش آئے ہیں کہ کوئی آدمی سوال کرنا چاہتا تھا لیکن آپؐ ان کے سوال کرنے سے پہلے ہی اس کے سوال اور مقصود کے بارے میں بتلا دیتے ہیں، جس سے مخاطب کا ذہن حیران اور اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے، چنانچہ بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے

---

[۱] بیہقی۔ [۲] بخاری ــــ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۳۲۔

کہ آپؐ کے پاس دو آدمی آئے، ان میں کا ایک انصاری اور دوسرا ثقفی تھا۔ آپؐ نے ثقفی سے فرمایا کہ اپنی ضرورت کے بارے میں سوال کرو! اور اگر چاہو تو میں ہی اس چیز کے بارے میں خبر دیدوں جس کے بارے میں تم سوال کرنا چاہ رہے ہو۔ تو انہوں (ثقفی) نے کہا، ہاں بتلایئے! لیکن یہ بات میرے لئے کافی تعجب خیز ہوگی، آپؐ نے فرمایا کہ تم اس واسطے آئے ہو کہ تم اپنی رات کی نماز، رکوع، سجود، روزہ اور غسلِ جنابت کے بارے میں دریافت کرو، انہوں نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، یہی وہ بات تھی جس کو پوچھنے کے لئے میں آپؐ کے پاس آیا تھا، یہی معاملہ دوسرے (انصاری) کے ساتھ بھی پیش آیا[1]

آج کے زمانہ میں جبکہ محکمۂ موسمیات باضابطہ طور پر قائم ہے اور اس کے پاس موسم کے تغیر و تبدل اور بارش وغیرہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے نازک آلات موجود ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر موسم اور بارش وغیرہ کے سلسلہ میں اس کی پیش قیاسی غلط بھی ثابت ہوجاتی ہے جس کا بارہا تجربہ کیا جاچکا ہے، لیکن نبی کریمؐ (جن کے زمانے میں اس قسم کے آلات سرے سے موجود ہی نہیں تھے) نے اپنی جائے سکونت کے بارے میں نہیں بلکہ یمن (جو مدینہ سے کافی فاصلہ پر ہے) کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی اور ایک عینی شاہد نے اس کی تصدیق بھی کردی، ملاحظہ فرمایئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت: ——— کہ ہمارے علاقہ میں تھوڑی بدلی آئی، تو ہمارے پاس نبی کریمؐ تشریف لائے اور فرمایا کہ بادلوں پہ مامور فرشتے کچھ دیر پہلے میرے پاس آئے تھے، انہوں نے سلام کیا اور مجھے بتایا کہ وہ بادلوں کو وادیٔ یمن کی جانب لے جارہے ہیں، اس وادی کو صریح کہا جاتا ہے (حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ) ہمارے پاس اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد ایک سوار آیا جس سے ہم لوگوں نے بادل کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا کہ ہاں اس دن بارش ہوئی تھی[2]۔

یہ تو وہ پیشین گوئیاں تھیں جن کا تعلق زمانۂ قریب سے تھا اور جس کی تصدیق فوراً ہوگئی، آپؐ کی کچھ پیشین گوئیاں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق زمانۂ بعید سے ہے مثلاً آثارِ قیامت، دجال کا خروج، حضرت مسیحؑ کی آمد اور کسریٰ کا مفتوح ہونا، ان میں سے اول الذکر کے بارے میں تو ہم آج مشاہدہ

---

[1] خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۰۱۔ [2] خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۰۳۔

کر رہے ہیں، دوسرے اور تیسرے کی تصدیق انشاء اللہ العزیز قربِ قیامت میں ہو ہی جائے گی، مؤخر الذکر کی بھی تصدیق حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد خلافت تک ہو چکی ہے، جیسا کہ حضرت عدیؓ کی روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلعم نے حضرت عدیؓ سے فرمایا کہ: اے عدی! کیا تم نے حیرہ (ایک جگہ کا نام ہے) کو دیکھا ہے، اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک بوڑھی اور ضعیف عورت حیرہ سے سفر کرکے بیت اللہ کا طواف کرے گی اور اسے اثنائے سفر اللہ کے علاوہ کسی اور کا خوف نہ ہوگا (یعنی چور ڈاکو رہزن وغیرہ سے اسے کچھ بھی اندیشہ نہ ہوگا، کیوں کہ اس وقت اسلامی سلطنت کے دائرے انتہائی وسیع اور راستے بالکل پُر امن ہو جائیں گے) پھر فرمایا کہ اگر تمہاری حیات طویل ہوئی تو تم لوگ کسریٰ کے خزانہ کو فتح کرو گے اور اگر تمہاری حیات مزید طویل ہوئی تو دیکھو گے کہ ایک آدمی اپنے ہاتھ میں سونا چاندی کو لے کر کسی ایسے آدمی کو تلاش کرے گا جو اسے قبول کر لے، لیکن اس سونے اور چاندی کو قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔[1]

اس حدیث میں آنحضورؐ نے جو پیشین گوئی فرمائی ہے ان میں سے دو تو حضرت عمرؓ کے ہی زمانہ میں پوری ہوگئی، اس وقت حضرت عدیؓ بقید حیات تھے، لیکن تیسری پیشین گوئی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں پوری ہوئی۔

نبی اور غیر نبی کی پیشین گوئی میں بس یہی فرق ہوتا ہے کہ نبی کی بات کا پورا ہونا قطعی اور یقینی ہے جبکہ غیر نبی کی پیشین گوئی کے لئے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ آیا وہ پوری ہوگی یا نہیں۔

●●

---

[1] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۲۴۔

قاضی کی ذہانت

یہ قصہ صدیوں پہلے کے الجزائر کا ہے
عرب سردار ابو عکاس وہاں بارہ قبائل بستیوں کا حاکم تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کی ریاست میں ایک قاضی ایسا بھی ہے جو بڑی ذہانت کے ساتھ فیصلے کرتا ہے بس سے ہر مظلوم کو انصاف مل جاتا ہے ابو عکاس نے اپنے لباس پر ایک تاجر کا لبادہ پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اس بستی کی جانب چل دیا تاکہ اس قاضی کے کام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ وہ بستی کے قریب پہنچا تو اسی بستی کی طرف جاتے ہوئے ایک کمزور اور لاغر شخص نے اس سے درخواست کی کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھالے۔ ابو عکاس نے اسے ساتھ بٹھالیا لیکن جب بستی میں پہنچ کر اسے اتارنا چاہا تو وہ شور مچانے لگا "لوگو، یہ ہٹا کٹا شخص میرا گھوڑا چھیننا چاہتا ہے، اتارو، اس ظالم کو میرے گھوڑے کے اوپر سے۔" لوگ اکٹھے ہوگئے اور دونوں کو قاضی کے پاس لے چلے۔ ابو عکاس کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے سوچا قاضی کی ذہانت آزمانے کا یہ اچھا موقعہ ہے۔

قاضی صاحب کے ہاں اس وقت دو مقدمے اور بھی پیش ہو رہے تھے۔
پہلا تنازعہ ایک پڑھے لکھے فلسفی اور ایک دیہاتی کے درمیان تھا۔ قریب ہی ایک عورت کھڑی تھی پڑھے لکھے شخص کا کہنا تھا کہ یہ میری بیوی ہے جب کہ دیہاتی کہہ رہا تھا کہ یہ میری بیوی ہے، عورت خاموش تھی اور بڑی خوف زدہ نظر آرہی تھی جیسے اسے خطرہ تھا کہ اگر اس نے ایک کے حق میں بولنے کی کوشش کی تو دوسرا اسے مار نہ ڈالے۔
دوسرا معاملہ اشرفیوں کی ایک تھیلی کا تھا۔ ایک بزاز اور ایک تیلی ــ دونوں اس تھیلی کے مالک ہونے کا دعوی کر رہے تھے۔ قاضی نے ابو عکاس اور گھوڑے کے مقدمے کو بھی غور سے سنا اور تینوں مقدمات کا فیصلہ دوسرے دن سنانے کا اعلان کر دیا۔
اگلے دن سب سے پہلے عورت کے مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ قاضی نے اسے پڑھے لکھے شخص کی بیوی

قرار دیا۔ دیہاتی کو پچاس کوڑے مارنے کی سزا دی گئی۔ دوسرے فیصلے میں اشرفیوں کی تھیلی بزاز کے حوالے کر دی گئی اور تیلی نے کوڑوں کی سزا پائی۔

تیسرے مقدمہ کا فیصلہ سنانے سے پہلے قاضی نے ابو عکاس کو سامنے اصطبل میں جا کر اپنا گھوڑا لانے کے لیے کہا۔ وہاں اسی نسل اور اسی قسم کے بیس گھوڑے کھڑے تھے۔ ابو عکاس کو بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ناکام واپس آگیا، اس کے بعد قاضی نے اس کمزور شخص کو گھوڑے کی شناخت کے لیے کہا تو وہ فوراً اس گھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔ قاضی نے فیصلہ سنایا، گھوڑا ابو عکاس کو دے دیا گیا اور بددیانت شخص کو تازیانے لگائے گئے۔ تاجر کے بھیس میں آنے والا عرب سردار ان فیصلوں پر حیران رہ گیا، اس نے اپنا اوپر کا لبادہ اُتار پھینکا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ تو ان کے سردار ابو عکاس ہیں۔

تب سردار نے قاضی سے ان فیصلوں کی وجہ پوچھی۔ قاضی نے کہا:۔ "یہ عورت رات کو میرے بال بچوں کے ساتھ رہی۔ صبح میں نے زنان خانے میں آواز دے کر اسے بلایا اور قلمدان میں تازہ روشنائی ڈالنے کے لیے کہا۔ اس خاتون نے دوات کی پرانی روئی پھینک دی۔ روشنائی تازہ روئی پر ڈالی۔ دوات کے کنارے صاف کیے اور قلمدان میرے سامنے رکھ دیا۔ ظاہر ہے اس کام کو سمجھنے والی اور باسلیقہ خاتون ایک پڑھے لکھے انسان کی بیوی تو ہو سکتی ہے، کسی جاہل شخص کی بیوی نہیں ہو سکتی۔ سُبحان اللہ! ابو عکاس پکار اُٹھا:۔ اور اشرفیوں کا فیصلہ کیسے ہوا؟۔

قاضی نے کہا:۔ میں نے اشرفیاں رات کو پانی کے ایک برتن میں ڈال دی تھیں۔ تھیلی بھی اس میں بھگو دی تھی۔ صبح جب دیکھا تو پانی کی سطح پر تیل کا ایک ذرّہ تک نہ تھا، جب کہ تیلی کے کپڑوں پر بھی تیل لگا ہوا تھا اور ہاتھوں پر بھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تھیلی کس کی ہو سکتی ہے۔ جزاک اللہ۔

ابو عکاس نے مسرت کے جذبات کے ساتھ کہا:۔ اور میرا معاملہ کیسے حل ہوا؟ میں تو گھوڑے کو پہچان بھی نہ سکا تھا۔ قاضی نے کہا:۔ "مسئلہ صرف آپ کے پہچاننے کا نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ گھوڑا بھی آپ کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ آپ جب اپنے گھوڑے کے پاس سے گزرے تو وہ خوشی سے ہنہنایا۔ جب کہ اس شخص کے پاس آنے پر گھوڑے نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لات گھمائی۔" حاکم نے آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا اور کہا:۔

بخدا آپ کا مقام میری مسند پر ہے مگر افسوس کہ میں آپ کی مسند پر بیٹھنے کا اہل نہیں۔

جدید اردو

نعتؐ کے خدوخال

عارف عبدالمتین

جدید اردو نعت کے خدوخال کی تعین کا فریضہ اس وقت بطریق احسن سرانجام نہیں دیا جا سکتا جب تک ہم قدیم نعت کے نین نقش سے اجمالاً ہی سہی، آگہی حاصل نہیں کر لیتے اور نعت کی روایت سے مختصراً روشناس نہیں ہو جاتے جیسا کہ تاریخ کے حوالے سے ہمیں پتہ چلتا ہے، عربی میں نعت کا آغاز حضرت ابوطالب سے ہوا، پھر مدینے کی لڑکیوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جو استقبالیہ اشعار پڑھے اور حضرت حمزہؓ، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہؓ سے جو نعتیہ اشعار منسوب ہیں ان سب کو نعت کے شروعات قرار دیا جا سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ انہیں بطور فن تخلیق نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت اور ارادت کے بے محابا بے ساختہ اظہار کی حیثیت رکھتے ہیں... البتہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، کعب بن زبیر رضی اللہ عنہ، اور امام محمد بن سعید شمس الدین بوصیریؒ کے ہاں نعت گوئی باقاعدہ فن کا اعزاز حاصل کر لیتی ہے۔ اور ہم حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زبان سے ایسا نعتیہ شعر بھی سننے کا شرف حاصل کرتے ہیں جس کے بارے میں بعض فن شناسوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج تک کسی زبان میں نعت کا کوئی شعر اس پر تفوق حاصل نہیں کر سکا۔ یہ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمایئے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

خُلِقتَ مُبَرَّاً مِّنْ کُلِّ عَیبٍ　　کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

... رسول اللہ! آپ کو ہر عیب سے پاک کیا گیا ہے گویا آپ ہوبہو ایسے پیدا کیے گئے جیسے خود آپ نے چاہا تھا۔

پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ایسے محکم اور حکیمانہ نعتیہ شعروں کا دلپذیر پیش کش کا اہتمام کرتے ہیں۔

لو لم یکن فیہ آیات مبینۃ　　　کانت بداھیۃ تغنی عن الخبر

اگر اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرنے والی واضح نشانیاں نہ بھی ہوتیں تو خود اس کی ذات اس کے پیغام کی صداقت کے کافی ہوتی۔

پھر کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ ایسا کیف آور قصیدہ تخلیق کرنے پر قادر ہوجاتے ہیں جو بانت سعاد کے نام سے شہرت آفاقی کا حقدار ہوا اور جسے سماعت فرماکر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ انبساط کے جلوئیں میں انہیں اپنی ردائے منزہ سے نوازا اور جس کا ایک شعر یوں ہے :

ان الرسول لنور یستضاء بہ　　　مھند من سیوف اللہ مسلول

بے شک اللہ کے رسول البتہ نور ہیں، روشنی حاصل کی جاتی ہے ان کی ذات سے سیف قاطع ہیں اللہ کی سونتی ہوئی تلواروں سے۔

اسی طرح امام محمد بن سعید شمس الدین بوصیریؒ ایک ایسا دلآویز قصیدہ سپرد قلم کرتے ہیں جو اس روایت کے حوالے سے دنیائے ادب میں "قصیدہ بردہ" کے نام سے موسوم ہوا کہ بوصیریؒ نے عالم خواب میں اسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں پیش کیا اور انہوں نے ان پر اپنی ردائے ہمایوں ڈال کر اپنی اس خوشنودی و مقبولیت کا اظہار فرمایا، جس کے فیضان سے بوصیریؒ نے اپنی جانکاہ علالت سے رہائی پائی اور جس کے دو روح پرور شعر یوں ہیں

وکل آیٍ اتی الرسول الکرام بھا　　　فانما اتصلت من نورہ بھم

جتنے معجزات اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسولوں نے پیش کیے بے شک انہیں یہ نعمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ارزانی ہوئی۔

فانہ شمس فضل ھم کواکبھا　　　یظھرن انوارھا للناس فی الظلم

بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم فضیلت و بزرگی کے مہر عالم تاب ہیں اور سارے انبیا اس آفتاب کے ستارے ہیں جو اندھیروں میں لوگوں کے لیے اپنے انوار کو ظاہر کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے قصیدہ "الطیب النغم" (بائیہ) میں اسی درخشاں صداقت کو ایک منزہ و تابندہ شعر میں یوں پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں :

وانک اعلی المرسلین مکانۃ　　　وانت لھم شمس وھم کالکواکب

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تمام رسولوں سے واضح و اعلیٰ ہے اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان کے لیے آفتاب ہے اور وہ ستاروں کی مانند ہیں۔

اردو نعت اپنے آغاز اور فروغ و ارتقار کے لیے عربی بالخصوص فارسی نعت کی مرہون منت ہے اور اس سلسلے میں مذکورہ نابغوں کے اثرات بڑے گھمبیر اور دوررس ہیں اور شیخ سعدی کا یہ نعتیہ شعر

حسنِ یوسف ، دمِ عیسےٰ ، ید بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اہل ذوق کی کتنی بڑی تعداد سے بے محابا ستائش کا حقدار بن چکا ہے اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے اور ان کے یہ لطیف نعتیہ پیکر

بلغ العلےٰ بکمالہٖ — کشف الدجےٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ — صلوا علیہ وآلہٖ

ہرچند کہ عربی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں تاہم فارسی اور اردو کی حدودِ اقتدار میں اپنی مقبولیت کی لامحدودیت میں اپنا مثیل نہیں رکھتے اسی طرح امیر خسرو کے یہ نعتیہ اشعار

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو!

محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

تو ہمیں اپنی کیف آوری کے تسلسل کا ادراک آج بھی ان پاکیزہ محفلوں سے بخوبی کرواتے ہیں جو نعت درود اور اسلام کے لیے خصوصی طور پر منعقد کی جاتی ہیں پھر مولانا جامی کی وہ نعتیہ غزل جو یوں طلوع ہوتی ہے۔

لی حبیب ، عربی ، مدنی ، قرشی

کہ بود درد و غمش مایہ شادی و خوشی

اپنی پذیرائی کے اعتبار سے لائق ہزار رشک مقام پر استادہ ہے اور حضرت قدسی کی وہ آفاق گیر شہرت رکھنے والی نعتیہ غزل جس کا دل پذیر مطلع یوں ہے:

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

تو جتنے صاحبانِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے ان کا شمار واقعتاً محال ہے اور یہ سعادت تو غالباً صرف

اسی نعت کے حصہ میں آئی ہے اور اردو اور فارسی کے سینکڑوں شاعروں نے اس کے اشعار کی تضمین کی اور یوں اس مقبولیت کی بیکرانی پر عملاً مہر تصدیق ثبت کی۔ یوں تو اردو کے بیشتر کلاسیکی شعراء نے نعت گوئی کی سعادت حاصل کی۔ مگر اس ضمن میں جنہیں قبول و نفوذ نصیب ہوا ان میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے اسمائے گرامی نسبتاً زیادہ اہم ہیں محسن کاکوروی کے قصیدہ لامیہ کو تو ہم اس اعتبار سے اردو کے بہترین قصائد میں سے ایک قرار دے سکتے ہیں کہ اس نے اپنی جدت طرازی سے اردو نعت کو ایک ایسے نئے موڑ سے آشنا کر دیا جو زبان اور ماحول کے اعتبار سے علاقائی حوالہ رکھتا ہے اور اردو نعت کو عقیدت کے جلو میں جذبے کی سطح پر استوار کر کے اسے محبت کے والہانہ پن کا مظہر بناتا ہے اس قصیدے کی تشبیب کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل،
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل،
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

واضح رہے کہ اس جمالیاتی اسلوب کے اولین سرچشمہ کا سراغ کعب بن زہیرؓ کے اسی نعتیہ قصیدے میں ملتا ہے جس کا تذکرہ آغاز گفتگو میں کیا گیا ہے اور جس کی تشبیب میں کعب بن زہیر نے اپنی محبوبہ سعاد کی زیبائیوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پر اپنے عدم تعرض سے نعت میں ایسے اسلوب رعنا کو بروئے کار لانے کا جواز ارزانی فرمایا ہے مگر یہاں اس امر کی طرف تاکیدی اشارہ کرنا بے حد ناگزیر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فراخدلانہ، عالی ظرفانہ اور جمال دوست طرز عمل ہمارے لیے ایسے طریق کار کی اجازت مرحمت نہیں کرتا کہ ہم نعت کہتے ہوئے حدودِ آداب سے سرمو تجاوز کر جائیں یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ نعت کی تخلیق کو بالکل بجا انداز میں تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے یہ محبت اور احترام کے دلآویز سنگم پر ظہور پر آتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سنگم کی تشکیل غیر معمولی دل و دماغ کے غیر معمولی اشتراک عمل کا ایک ایسا تقاضا کرتی ہے جس کی تکمیل جوئے شیر لانے سے کسی طور کم نہیں!

محسن کاکوروی کے بعد مولانا حالی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کا نعتیہ کلام دراصل اردو نعت میں جدیدیت کا در وا کرتا ہے اگر قدیم نعتیہ شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے نعت کے لغوی معنی و مفہوم کو جو مدح ثنا تعریف اور توصیف پر اپنی تمام تر فکری و جذباتی جامعیت کے ساتھ محیط ہے بحیثیت مجموعی یوں تحدید آشنا کر دیا کہ نعت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثال سراپے، ان کے حلیۂ اقدس اور

ان کے تحیر خیز معجزات کے عقیدت آگیں بیان سے وابستہ ہوگئی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین شخصیت کے وہ پہلو، اس میں اپنا بھرپور اظہار نہ پا سکے جو نعت کے لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر ہستی ایک طرف عرفانِ خداوندی کا موجب بنتی ہے دوسری طرف معرفتِ کائنات کا سبب ٹھہرتی ہے اور تیسری طرف شعور ذات کا وسیلہ قرار پاتی ہے گویا ہماری کلاسیکی نعت نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مقابلے میں صورت پر اپنی توجہ نسبتاً زیادہ مرکوز رکھی اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نعت ارادت اور احترام کا دلآویز مظہر بن کر تو ابھری اور اس میں شبہ نہیں کہ اس حوالے سے اس نے ہمیں

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجھک المنیر لقد نور القمر،
لایمکن الثناء کما کان حقہ،
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر،

(شاہ عبدالعزیز دہلوی)

جیسے نادر قطعے اور

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم،
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمد است

(اسداللہ خاں غالب)

جیسے بے مثال شعر ارزانی کیے مگر اس رویہ نے اس امر گونہ حقیقت کو جنم بھی دیا کہ نعت اگر ایک طرف جذباتی آمیختگی ______ کی متوقع سطح کے حصول میں ایک مخصوص قسم کے ضعف کی آئینہ دار بن گئی اور یوں تخلیقی فن کے حوالے سے اس کا مقام متاثر ہوا تو دوسری طرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی ان معنوی عظمتوں کو احاطہ کرنے میں مستغرق ہو سکی جو انفس و آفاق کے اعتبار سے لامحدود اہمیت اور نہایت قدر و منزلت رکھتی ہے کیونکہ یہی وہ عناصر ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو ایسی لاعصریت عطا کرتی ہیں جو جہد میں اس کے مخصوص تقاضوں کی یقین و تفہیم کر کے ______

اپنے آپ کو یوں نمایاں کرتی ہے کہ اس میں عصریت ______ آجاتی ہے جسے روحِ عصر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جدید نعت نے روایتی نعت کو اس کی مذکورہ تحدید سے آزاد کر کے ایک مجتہدانہ اقدام کیا ہے اور ہم

دیکھتے ہیں کہ جدید نعت جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جذباتی اور احساساتی تحریک کا فیضان حاصل کرکے اپنی فنی سطح کو ارفع تر بناتی ہے اور اس کی تخلیقی گرفت کو مضبوط تر بناتی ہے وہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پیکر زریں سے اکتساب نور کرتی ہے اور ان کے کردار کے گوناگوں اوصاف حمیدہ سے اور عمرانی حوالے سے ان کے افعال و اعمال کی نوعیت وو قعت کا ادراک کرکے آشوب ذات اور آشوب کائنات پر قابو پانے اور ان کا موثر سد باب کرنے کے طریقے نہ صرف خود سوچتی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی سمجھاتی ہے اور یوں وہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر فروغ دار تقاء کی راہیں کھول کر شخصی، قومی، ملی اور بالآخر انسانی نشو و ارتقاء کے امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے میں گراں قدر معاونت کرتی ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ جدید نعت نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے حق کی بے خوف حمایت، شر کے خلاف بے مفاہمت جہاد کے دوران میں صبر و استقامت کا اولوالعزمانہ مظاہرہ رنگ اور نسل کے بتوں پر حوصلہ مندانہ تیر زنی، غلامی، استعمار اور استبداد کے ہر خفی و جلی روپ سے نبرد آزمائی اور آزادی، حریت اور انسانی مساوات کی ترویج و اشاعت کے لیے انقلاب آفریں جدوجہد کو اپنے عظیم موضوعات کے طور پر کیسے اپنایا کیونکر وہ ہمارے عہد غلامی کے ابتلا کی غمگسارانہ عکاسی پر بھی قادر ہوئی، اور کیونکر اس نے ہماری قومی شناخت کا بے نظیر فریضہ سرانجام دے کر ہمیں نہ صرف بیرونی سامراج سے طویل خونچکاں آویزش کی بدولت ایک آزاد مملکت کے حصول کے قابل بنایا بلکہ کرۂ ارض کی تمام محکوم و مجبور اقوام کو رستگاری اور خود مختاری کی راہ دکھانے میں بھی بالواسطہ طور پر گراں قدر کردار انجام دیا ہے۔

جدید نعت کے اولین ظہور کے ایک نمونہ کے طور پر مولانا حالی کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمایئے اور قومی آشوب کے دل گداز اظہار سے نعت کے مفہوم کی توسیع کا اندازہ کیجیے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں

اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

اسی طرح علامہ اقبال کی جدید نعتیہ لے میں ارتفاعِ ذات اور فروغِ کائنات کے اس زیر و بم کا قیاس کیجیے جو فکر و جذبہ کی ہم آہنگی سے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

اب جدیدیہ نعت کے ایک اور بڑے علمبردار مولانا ظفر علی خان کی معروف نعت کے ضیا پاش، توحید آگیں اور حریت پسندانہ لب و لہجہ سے حظ اٹھایئے، وہ کہتے ہیں:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں — اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر — وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینہ زاروں میں
ہم حق کے علمبرداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی — بادل کی گرج تکبیروں میں، بجلی کی تڑپ تلواروں میں

مولانا حالی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کے علاوہ جن فنکاروں نے اپنے منفرد اسلوب میں اردو نعت کے جدید رنگ روپ کو نکھارا سنوارا ان میں مولانا حسرت موہانی، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، احسان دانش، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، مولانا احمد رضا خان بریلوی، روشن صدیقی، بیدم وارثی، امجد حیدر آبادی، اثر صہبائی، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر سید صفدر حسین، مولانا ماہر القادری، مولانا نعیم صدیقی، حافظ مظہر الدین، عبدالکریم ثمر، آذر عسکری، محشر رسول نگری، منظور حسین شور، اقبال عظیم، یوسف ظفر، قیوم نظر، ظہیر کاشمیری، ادا جعفری، شیر افضل جعفری، حنیف اسعدی، سجاد باقر رضوی، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، محسن احسان، رضا ہمدانی، قتیل شفائی، جمیل ملک، ظہور نظر، جعفر طاہر، حمایت علی شاعر، احمد شمیم، احمد ظفر، افضل پرویز، طفیل ہوشیار پوری، انجم رومانی، شہرت بخاری، سید فیضی، سراج الدین ظفر، عاصی کرنالی، تبسم رضوانی، توصیف تبسم، سرمد مظاہری، ساغر صدیقی، راسخ عرفانی، عاصم گیلانی، اختر انصاری اکبر آبادی، مجیب خیر آبادی، فضل حق، طفیل دارا، محمد اعظم چشتی، خالد بزمی، راز کاشمیری، راجا رشید محمود، منیر قصوری، شبنم رومانی، امین طارق قاسمی،

انوار ظہوری، ریاض حسین چودھری، تاب اسلم، اقبال سرہندی، ساقی گجراتی، میرزا فیض کوثر، ملیم ناصری، حافظ امرتسری، عابد نظامی، رفعت سلطان، جیلانی کامران، مرزا محمد منور، غلام رسول ازہر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، طاہر شادانی وغیرہ کے نام اہم ہیں نعت کے اس نئے روپ کی ایک نظر افروز جھلک دیکھنے کی غرض سے مولانا نعیم صدیقی کی ایک نعت کے چند اشعار کا مطالعہ فرمایئے وہ کہتے ہیں:

دلوں کو رکھی ہے چاہ تیری، غموں نے گلشن سجا سجا کے — شبوں کو دیکھی ہے راہ تیری، دیئے پلک پر جلا جلا کے

تمام ذروں میں خاکِ رہ کے ہزاروں عالم مچل رہے ہیں — یہ علم و دانش، یہ تاج و سطوت ہیں معجزے تیرے نقشِ پا کے

خود آگہی کا سبق سکھایا مقام انسانیت دلایا — غروروالوں کے سر جھکا کے پسے ہووں کو اٹھا اٹھا کے

دلائی پھر بندگی کی عظمت بڑھائی پھر زندگی کی عزت — سجائی کیا محفلِ اخوت شہ و گدا کو گلے ملا کے!

خود اپنے گھر میں تھا فقر و فاقہ مہینوں ٹھنڈا رہا ہے چولہا — بھری زمانے کی تونے جھولی، غنا کی دولت لٹا لٹا کے

اب نعت کے آہنگِ نو کا خوشگوار ذائقہ چکھنے کے لیے سیّد امداد علی شاہ روشنؔ القادری اور احمد ندیم قاسمی کی علی الترتیب نعتیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کیوں اوج ثریا پہ نہ ہو اپنا مقدّر — یا شافع محشر
کرتا ہے عطا دل کو سکوں تیرا تصور — یا شافع محشر

آقا جسے مل جائے تیرے در کی گدائی — غم سے ہو رہائی
تیرے درِ اقدس کے بھکاری ہیں سکندر — یا شافع محشر

عاصی پہ عنایت کی نظر بحرِ سخا ہو — اک جام عطا ہو
اللہ نے دیا تجھ کو لقب ساقیٔ کوثر — یا شافع محشر

ہے ظلمتِ عصیاں سے میرے دل میں اندھیرا — پھر ہو دے سویرا
کر نور سے اپنے میرے سینے کو منور — یا شافع محشر

خاکِ درِ اقدس کو نگاہوں میں بسا لوں — تقدیر جگا لوں
ہو جائے جو دیدارِ درِ روضۂ اطہر — یا شافع محشر

ہر حال میں روشنؔ تیری نسبت پہ ہے نازاں — اے درد کے درماں
پھر اور کدھر جائے بھلا آپ کا چاکر — یا شافع محشر

(روشنؔ قادری)

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

پورے قدسے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا یہ سہارا تیرا

شرق اور غرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

(قاسمی)

اب عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی سے کیف و نور کا اکتساب کیجئے۔ وہ کہتے ہیں:

ہمہ آیۂ نور و خلقِ مجسم
تو محبوب یزداں و نورِ ہُدا ہے
تو فقر و قناعت کا روشن منارہ
محمدؐ ہے، احمدؐ ہے تو مصطفےٰؐ ہے!
تو دلجوئی و غم گساری کا پیکر،
تو خیرالبشر، اشرفِ انبیاءؐ ہے
رہِ حق میں رہتا ہے پیہم تو ساعی
حقوقِ قرابت کو پہچانتا ہے!
اولوالعزم، عالی ہمم، خانِ عالمؐ
تو ختم الرسل، خاتم الانبیاءؐ ہے!

اور اب عابد نظامی کی اس نعت کے چند اشعار کا مطالعہ کیجئے جو ملی آشوب، کی دردمندانہ ترسیل اور اپنے استمدادی لہجے کے حوالے سے ایک نہایت موثر فن پارہ کہلانے کی مستحق ہے اور جس کے فکر و جذباتی ڈانڈے مولانا حالی کی مسدس سے ملتے محسوس ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں:

خلق کو خالقِ اکبر سے ملانے والے
حق کا پیغام زمانے کو سنانے والے
آج امت کی بھی سوئی ہوئی تقدیر جگا
کرۂ ارض کی تقدیر جگانے والے

نام لیوا تیرے محتاج ہوئے غیروں کے
علم و تہذیب زمانے کو سکھانے والے
کتنے ہی ملکوں میں محکوم ہیں تیرے شیدا
نوع انسانی کو غلامی سے چھڑانے والے
تیری امت نہ ہو دنیا میں کسی کی محتاج
فخر کونین اے رحمت کے خزانے والے!

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان نمونوں میں فنکاروں کی ساری توجہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مرکوز ہے اور وہ ان کے کردار کی تحسین کے حوالے سے خود شناسی، کائنات شناسی اور خدا شناسی کے مراحل طے کرنے میں کوشاں ہیں۔

ہم نے اسوۂ حسنہ کے حوالے سے جدید نعت کی جس سہ گونہ عطا یعنی خود شناسی، کائنات شناسی اور خدا شناسی کا ذکر کیا ہے اس سے یہ بات متقدر ______ ہو جاتی ہے کہ جدید نعت ایک ایسی منفرد نوعیت کی تخلیق کا ارفع مقام حاصل کر گئی ہے جس کے ظہور کے لیے اس کے خالق کا حلقہ بگوش اسلام ہونا لازمی شرط کی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس شخصیت کی عظمت کے بارے میں قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہے[۱] اور جو خود اپنے منصب جلیلہ کا تعین کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اسے اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے[۲] اس کے کردار کے اثر و رسوخ کا دائرہ کیونکر صرف ان فنکاروں تک محدود رہ سکتا ہے جو اصطلاحی معنوں میں اس پر ایمان لائے ہوں حقیقت یہ ہے کہ ایسی بے مثال ہستی کی بے مثالیت کا ناگزیر تقاضا تھا کہ اس کا قبول و تاثر عالمگیر ہوتا اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی گہرائی ہی میں اضافہ نہ ہوتا بلکہ اس کی گیرائی بھی فزوں تر ہوتی اور یہ بات پوری انسانیت کے لیے باعث افتخار ہے کہ عہد نو میں یہ ناگزیر تقاضا بطریق احسن پورا ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید نعت کے مرحلے میں توسیع کا اعزاز ان شعرا کو بھی حاصل ہوا جنہیں معروف ایمانی مفہوم کے مطابق وابستگانِ رسول صلی اللہ علیہ میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں دتو رام کوثری سے قطع نظر کہ وہ مدح پیمبر کرتے کرتے اور اس دوران میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی معنوی تہوں سے آشنائی

حاصل کرتے ہوئے بالآخر دائرہ دین میں اعلانیہ داخل ہوگئے تھے۔ پنڈت ہری چند اختر، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، بالمکند عرش ملیانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مہاراج کشن پرشاد شاد اور منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے نام اہم ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے سلسلے میں ان شعراء کی حدودِ فہم کا اندازہ کروانے کے لیے صرف پنڈت ہری چند اختر اور جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کو نمونہ کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اول الذکر کہتے ہیں:

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا — کس نے ذرّوں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِ یتیم — اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا — اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اور موخرالذکر رقمطراز ہیں:

حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا
بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے راہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا
خلیق آیا، کریم آیا، رؤف آیا، رحیم آیا
کہا قرآں نے جس کو صاحب خلقِ عظیم آیا
سراپا علم بن کر صاحب ام الکتاب آیا
زمینِ تشنہ لب کی زندگی بن کر سحاب آیا

نئی نسل نے نعت نگاری کی طرف بالخصوص توجہ مبذول کی ہے اور اس کی جمیل کوششوں سے نعت روحِ عصر کی ایک انتہائی اہم نمائندہ بن کر ہمارے ادب میں غیر معمولی قدر و منزلت کی حامل ہو گئی ہے نئی نسل میں جن فنکاروں کی نعتیہ عطائیں نسبتاً زیادہ وسیع ہیں ان میں حفیظ تائب، منیر نیازی، مظفر وارثی، رضی ترمذی، حافظ لدھیانوی، بشیر منذر، اقبال صلاح الدین، صلاح الدین محمود، عرش صدیقی، صلاح الدین ندیم، عبدالشکور بیدل، کامل القادری، محمد افضل فقیر، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، کشور ناہید، عطاالحق قاسمی، اختر امان، خالد احمد، نجیب احمد، پروین شاکر، ناہید قاسمی، سیف زلفی، اقبال ساجد، اظہر جاوید، طاہر تونسوی

الطاف قریشی، عبدالستار سید، اطہر نفیس، صہبا اختر، سلطان رشک، حسن رضوی، حفیظ صدیقی، حفیظ احسن، اطہر صدیقی، زاہدہ صدیقی، رشید کامل، واصف علی واصف، رشید قیصرانی، ظہیر صدیقی، نعیم اظہر، یوسف مثالی، خالد شفیق، حامد حسن حامد، تحسین فراقی، جعفر بلوچ، یونس احقر، شاہد واسطی، خالد جذبی، جان کاشمیری، سرفراز عامر، ضیا رنیر، اصغر عابد، قائم نقوی اور محمد نواز کے نام سرفہرست ہیں۔

نئی نسل کی نعتیہ کاوشوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

سرچشمۂ اقدارِ منور تری سیرت
سرنامۂ پیشانیٔ خاور تری سیرت
زیبائیٔ افکار کا مصدر تری گفتار
رعنائیٔ کردار کا جوہر تری سیرت
تخلیق کے چہرے کی ضیا ہے تری ہستی
تہذیب کے ماتھے کا ہے جھومر تری سیرت
ہر رہ پہ مرا ہاتھ لیے ہاتھ میں اپنے
چلتی ہے مرے ساتھ برابر تری سیرت

(حفیظ تائب)

مجھ کو بھی اس زمین پہ معراج بخش دے
توفیق دے کہ خود کو ترا نقشِ پا کہوں
میدان زندگی میں میرے ہاتھ شل نہ ہوں،
حق بات دل میں ہو تو کہوں، برملا کہوں
پھر خاکداں کو تیری ضرورت ہے لوٹ آ
یہ بات کس سے دہر میں تیرے سوا کہوں
شہزاد مانگتا ہے دعا سب کے واسطے
کس طرح اپنی ذات کو سب سے جدا کہوں

(شہزاد احمد)

میرے احساس کے دریا میں روانی تجھ سے
لے گلِ جاں، میرے ہونے کی نشانی تجھ سے
موسم گل بھی تیرا، فصلِ خزاں بھی تیری
میری آواز کے صحراؤں میں پانی تجھ سے
تجھ ہی سے میری تمناؤں نے وسعت پائی
آنکھ کے رنگ، سماعت کے معانی تجھ سے

(امجد اسلام امجد)

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی
سرحدِ رنگ بہ عنوانِ اخوت ڈھائی
ورقِ دہر پہ ہر سطر محبت لکھی
تو نے ہر ذرے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی
تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی، بہ پیرایۂ سیرت لکھی

(خالد احمد)

نعت ایک طویل عرصے تک اپنے اظہار کے لیے قصیدے یا غزل کا مروجہ پیرہن بروئے کار لاتی رہی ہے مگر گذشتہ چند برسوں میں جدید نعت نے فارم کے اعتبار سے آزاد نظم کو اپنا کر اس حقیقت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ نئے افکار کی ترسیل کے لیے بسا اوقات نئی ہیت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے ان آزاد نعتیہ نظموں میں نئی شاعری کے اسی آب دار عنصر کا بالخصوص لحاظ رکھا گیا جو ایمانیت سے عبارت ہے اور جو معانی الضمیر کے اظہار کے لیے علائم و رموز کو بروئے کار لانے کا قائل ہے اسی علامتی طرزِ ابلاغ نے جدید نعت کو ایک ایسی تہہ داری سے ہمکنار کیا ہے جس نے اسے نہ صرف مزید عمق فراہم کیا ہے بلکہ اس کو ایک انفرادی آن بان بھی ارزانی کی ہے۔ میری منکسرانہ رائے میں جدید نعت کا یہ مخصوص و منفرد ادب مستقبل میں مستحکم بنیادوں پر استوار ہو گا اور اس کے نین نقش کی تعیین میں اہم کردار ادا کرے گا کیونکہ نئے ادب کے ان خالقین اور قارئین کے لیے اس میں زیادہ کشش ہے جن کی تربیت بنیادی طور پر آزاد علامتی نظم کے ماحول میں ہوئی ہے۔

رشید قیصرانی کی مندرجہ ذیل نعتیہ نظم کو آزاد علامتی نعت کی ایک خوبصورت مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتے ہیں:

اک دیپ جلا اندھیاروں میں
ظلمت کے بپھرے سینوں سے
اک چیخ اٹھی
اک شور مچا
یہ روپ سروپ اندھیاروں کا
برسوں سے قائم دائم ہے
یہ کس کی جرأت ؟
کس کا دم ؟
یہ کون ہماری نگری میں،
ظلمات کا دم یوں نوچتا ہے ؟
صدیوں کی سوئی دھرتی پر،
یہ کون اجالے پھینکتا ہے،
بے خوف و خطر،
چپکے چپکے
وہ دیپ مگر جلتا ہی رہا،
یہ دیکھ کے ظلمت گاہوں سے،
کچھ زہر بھرے اژدر نکلے،
کچھ سانپ سنپولے در آئے
کچھ تند ہوائیں چیخ اٹھیں،
کچھ تیز بگولے لہرائے،
ظلمات کی ساری سینائیں،
اک تنہا دیپ پہ ٹوٹ پڑیں،
اتنے میں کچھ پروانوں نے،
اس دیپ پہ گھیرا ڈال لیا۔
یہ پروانے لاچار بھی تھے،
کمزور نحیف و نزار بھی تھے۔

پر دیپ کی رکھشا کی خاطر،
وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر،
طوفان کے منہ میں کود پڑے،
کچھ پار گئے،
کچھ ڈوب گئے،
یلغار سے پروانوں کی مگر،
طوفان کے چھکے چھوٹ گئے،

اتنے میں کچھ بیراگی بھی،
قندیل جلانے آپہنچے،
وہ دیپ جو تنہا جلتا تھا
اس دیپ سے لاکھوں دیپ جلے،
طوفان کا سینہ چاک ہوا،
دم ٹوٹ گیا اندھیاروں کا،

شعراء کی نئی نسل کو علامہ اقبال کے اس لطیف ترین نکتہ کا نہ صرف فہم میسر آچکا ہے بلکہ اس نے اپنے فن کے ذریعے اس کی عملی تفسیر بھی پیش کرنے کا تہیہ کر لیا ہے جسے انہوں نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست،
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

خواب میں زیارتِ رسولؐ کی دُعا

ہندوستان کے عالم باعمل حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے ایک بار مشہور صاحب دل بزرگ حضرت مولانا فضلِ رحمٰنؒ گنج مرادآبادی سے پوچھا کہ کوئی خاص درود شریف بتائیے جس کے وِرد سے زیارتِ رسولؐ نصیب ہو، فرمایا کہ کوئی خاص درود تو نہیں ہے بس اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، پھر کچھ سوچنے کے بعد فرمایا:-

"البتہ سیّد حسن صاحبؒ کو اس درود کا عمل کارگر ہوا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعِتْرَتِہٖ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ۔

اے اللہ! رحمت نازل فرما محمدؐ پر اور ان کی آل پر اور ان تمام چیزوں کی تعداد کے بقدر جو تیرے علم میں ہیں ـــــــــــ

بابری مسجد

از: حضرت مولانا برکت اللہ صاحب جوہر قاسمی
استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

بابری مسجد کا مسئلہ الجھنِ قومی نہیں
دورِ بابر میں شروع ہوکر مکمل ہوگئی
دورِ ماضی میں کسی نے کی نہیں چیخ و پکار
ڈر اگر بابر سے تھا اکبر سے کوئی ڈر نہ تھا
عہدِ ماضی کی خموشی سے حقیقت ہے عیاں
غیر کی بھومی پہ مسجد ہم بناتے ہی نہیں
ظلم کی تاریکیوں سے دور رہتے ہیں سدا
سرزمینِ ہند پر جو حکمراں ہو بے گماں
وہ رسوئی گھر جنم بھومی کو لے گا کس طرح
بھاگتے کیوں ہو قوانین و عدالت سے بتاؤ
کیوں نہیں کہتے عدالت جو کرے گی فیصلہ
اف حکومت بھی تمہاری ہی طرح کمزور ہے
بابری مسجد کو تم ہرگز ہڑپ سکتے نہیں
کوئی کہتا ہے کہ پیدا رام اجودھیا میں ہوئے
شاستروں سے بھومی کی تعیین کرتے کیوں نہیں
کب تلک ظلم وستم کا زور دکھلاؤگے تم
نام پر راما کے راون کی کہانی کب تلک
راس آئیں گی نہ ہرگز تم کو گیدڑ بھبھکیاں
ہے گزارش ہند کے مسلم کی تم سے غاصبو!
ہے گزارش کانگریس و مرکزی سرکار سے
ہند کے غافل مسلمانو! مدبر ہندوؤ!
ظالموں کو ظلم سے تم روکتے ہو کیوں نہیں
یاد رکھو تم اگر اس ظلم پر قائم رہے

بابری مسجد ہے مسجد یہ جنم بھومی نہیں
پھر اذانوں اور نمازوں سے مدلل ہوگئی
جب کہ اس میں روز و شب گونجیں اذانیں بار بار
گھر میں جودھا بائی تھی اور مان سنگھ لشکر میں تھا
بابری مسجد ہے مسجد ہاں جنم بھومی نہیں
شرک میں توحید کا دامن پھنسلتے ہی نہیں
غیر کے احساں سے کوسوں دور رہتے ہیں سدا
زورِ بازو سے لرز جاتے ہوں جس کے ہندیاں
اک بہادر بزدلی کو تھام لے گا کس طرح
رتھ پھراتے یگ کرتے کیوں ڈراتے ہو بتاؤ
مان لیں گے ہم بھی بے چون وچرا یہ فیصلہ
تم سے ڈرتی ہے دکھاتی ہم پہ ناحق زور ہے
بابری مسجد میں ہرگز بت پنپ سکتے نہیں
کوئی کہتا ہے کہ پیدا وہ کیرالا میں ہوئے
حیف تاریخی شہادت پیش کرتے کیوں نہیں
کب تلک مسجد میں آخر بت کو بٹھلاؤ گے تم
نام پر سیتا کے سپنیکھا کی بانی کب تلک
ہیں تمہاری دھمکیاں کل جگ کی گیدڑ بھبھکیاں
بابری مسجد کا کردو تخلیہ اے غاصبو!
فیصلہ ہو وے عدالت سے نہیں سرکار سے
گلشنِ امن و وفا کے باغباں تم بھی تو ہو!
مرکزی سرکار کو تم ٹوکتے ہو کیوں نہیں
بابری مسجد میں پوجا پاٹ پر قائم رہے

عہدِ ماضی کا اعادہ پھر سے ہوگا ایک دن
جوہرِ عدل و شجاعت پھر کھلے گا ایک دن

ھُوَاللّٰہُ اَحَد

نتیجۂ فکر: — خالد سیف اللہ رحمانی

کس نے بادِ مست کی آغوش میں رکھا سحاب
ڈالتا ہے کون کشتِ خاک میں تخمِ حیات
کون ہے جس نے جلایا ہے یہ سورج کا چراغ
مادرِ گیتی کے سینہ کو کیا ہے کس نے چاک
کون ہے جس نے جلایا شب میں ہے یہ شمعِ ماہ
کس نے گردوں کی جبینِ ناز پہ افشاں رکھا
پھونکتا ہے کون مشتِ خاک میں روحِ حیات
کس نے رکھا سینۂ زن میں محبت کا رباب
کس کے دستِ فیض سے جاری ہے بحرِ ناکنار
گیت کس کے گا رہی ہے آخرش بادِ بہار
کس نے آغوشِ مگس میں رکھ دیا قند و نبات
کس کے ابرو کے اشارے پر برستا ہے سحاب
خوشۂ گندم کے لب پر یوں ہے شبنم بوسہ زن
کون ہے اس کائناتِ رنگ و بو کی پشت پر
دیکھ لے چشمِ بصیرت! دیکھ لے دنیا شناس!
ہے یہی کافی نشاں اہلِ خرد کے واسطے،
وہ خدا جو ہے غریبوں ناتوانوں کی اماں
وہ خدا جو دل میں ہے پھر بھی ہے برتر از گماں
وہ ہے روشن مہر عالمتاب کے جلوؤں میں بھی
یہ نسیمِ صبح، یہ بادِ شمیمِ یاسمن
یہ بہار و کیف، یہ دلکش گلستان و چمن
وہ نہیں رہتا ہے سنگ و خشت کی دیوار میں
وہ نہیں رہتا ہے کوہ و دشت میں یا غار میں

گھن گرج بجلی کی ہے کس کی نگاہوں کا عتاب
کون دیتا ہے زمیں کو زیست سے آخر نجات
کیا کسی نے اس کی وسعت کا لگایا ہے سراغ
کس نے آب و گِل کو پہنائی ہے گندم کی نقاب
کس نے شاعر کو عطا کی ہے بصیرت کی نگاہ
کس نے انجم کو اندھیروں میں ضیا افشاں رکھا
حکم سے کس کے نگل جاتا ہے عفریتِ ممات
کس نے سکھلایا ہے مردوں کو مجاہد کا شباب
حکم سے ہے کس کے رقصاں آفتابِ شعلہ بار
کس کے ہاتھوں میں ہے ان بیتاب موجوں کی مہار
سینۂ مادر ہے کیوں سرچشمۂ آبِ حیات
کس کی مرضی ہے کہ آن جاہے بھی جاتا ہے شباب
اور شاخِ سبز کے سینے سے غنچہ خندہ زن
کون سا فرماں روا ہے اس جہاں کے تخت پر
کیا نہیں ہے اس نظامِ بوالعجب کی کچھ اساس؟
یعنی تسلیمِ ھواللہ احد کے واسطے
وہ خدا جو دردمندوں کے لئے تسکینِ جاں
وہ خدا کہ ذرہ ذرہ اس کی قدرت کا نشاں
چاند کی خنکی میں، گُل میں، لالہ میں، کلیوں میں بھی
یہ روش سبزوں کی، یہ جوہی، یہ موتی، نسترن
یہ سبھی ہیں اس کے حسنِ ناز کی اک انجمن
وہ نہیں رہتا ہے عیش و طرب کے بازار میں
ہاں اگر رہتا ہے تو رہتا ہے قلبِ یار میں

ہر جگہ موجود ہے ہر گام پہ رہتا ہے وہ
ناتواں، کمزور کی، مظلوم کی سنتا ہے وہ

سوال و جواب

خالد سیف اللہ رحمانی

اگر والدین طلاق کا مطالبہ کریں

زید کی خوشدامن اور اس کے گھر کے دوسرے لوگ بدزبان واقع ہوئے ہیں، چنانچہ زید کی خوشدامن نے زید کے والد کے بارے میں اس کی عدم موجودگی میں کچھ بدگوئی کی اور ناشائستہ باتیں اس کے متعلق کہی، واضح ہو کہ زید کی زوجہ بذات خود شریف اور اس نے اس طرح کی بدکلامی میں حصہ نہیں لیا ہے، اب زید کے والد کا زید سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنی زوجہ مذکورہ کو طلاق دیدے، پس کیا صورت مذکورہ میں پدر زید کا طلاق کا مطالبہ کرنا اور زید کا طلاق دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب و باللہ التوفیق

طلاق دینا اصلاً ناجائز اور گناہ کی بات ہے، حدیثیں اس کی مذمت میں کثرت سے موجود ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاندان میں طلاق کا پیش آجانا وہ امر ہے جو شیطان کے لئے سب سے زیادہ خوشی اور مسرت کا باعث ہے، ظاہر ہے کہ ایسی چیز اصلاً جائز اور درست نہیں ہوگی لیکن چوں کہ مزاج و طبیعت کی باہمی ناموافقت، یا بیوی کی عدول حکمی اور حق کی عدم ادائیگی باہم زوجین کے درمیان ایک دوسرے سے ایسی نفرت کا سبب بن جاتی ہے کہ رشتۂ نکاح کو ختم کر دینے ہی میں طرفین کے لئے عافیت ہوتی ہے، ایسے حالات میں ضرورتاً طلاق کی اجازت دی گئی ہے بلکہ بیوی اگر بدکردار اور عصمت و عفت کے لحاظ سے پاک دامن نہ ہو، نیز اپنے اصلاح کی توقع بھی نہ ہو تو طلاق دینا واجب بھی ہو جاتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں کثرت سے اس کی نظیریں موجود ہیں،

علامہ عبدالرحمٰن جزیری لکھتے ہیں:- والحاصل ان الطلاق وان کان محظورا فی ذاته ولکنه عند وجود سبب یوجبه او یجعله مندوبا (کتاب الفقہ ج ۴ ص ۲۹۹)

علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں: لایباح ایقاع الطلاق الاعند الضرورة لقوله صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ کل ذواق مطلاق وقال ایما امرأة اختلعت من زوجها من نشوز فعلیها لعنة اللہ والملئکة والناس اجمعین وقد روی مثله فی الرجل یخلع امرأته ولان فیه کفران النعمة (المبسوط للسرخسی ج ۶ ص ۲)

فقہ حنبلی کے مشہور شارح علامہ مقدسی نے طلاق کی اقسام ذکر کرتے ہوئے طلاق مکروہ کی تعریف اس طرح کی ہے:- ومکروہ وهو الطلاق من غیر حاجة الیه وقال القاضی فیه روایتان: احدهما انه محرم، لانه ضرر بنفسه وزوجته واعدام للمصلحة الحاصلة لهما من غیر حاجة الیه فکان حراما کاتلاف المال ویقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لاضرر ولا ضرار" والثانیة انه یباح، یقول النبی "ابغض الحلال الی اللہ الطلاق" وفی لفظ "ما احل اللہ شیئاً ابغض الیه من الطلاق" رواہ ابوداؤد، وانما یکون مبغوضاً من غیر حاجة الیه وقد سماه النبی حلالاً، ولانه مزیل للنکاح المشتمل علی المصالح المندوب الیها فیکون مکروهاً۔

(المغنی ج ۷ ص ۲۳۶)

علامہ ابن نجیمؒ نقل کرتے ہیں:-

ومن الناس من یقول لایباح ایقاعه الالضرورة کبر سنن او ریبة لقوله علیه السلام لعن اللہ کل مذواق مطلاق۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۲۳۶)

مشہور حنفی فقیہ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے (فتح القدیر ج ۲ ص)

اس میں شبہ نہیں کہ بعض اہل علم نے طلاق کو اصلاً مباح قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلائل شرعیہ اصلاً اس کے ممنوع اور ناجائز ہونے کو بتاتے ہیں، نیز ہندوستان کے معاشرہ میں عورت کو اس کی وجہ سے جو ضرر شدید پہونچتا ہے اور اس کے اہل خاندان کو جو اذیت پہنچتی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اور جو چیزیں معصیت ہیں ان میں والدین کی اور کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

(لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق) فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ ایسے مباح امور جس میں کوئی دینی اور دنیوی نقصان نہ ہو والدین کی اطاعت ضروری ہے، اسی اصول پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص طلبِ علم کے لئے سفر کرے اور اس سفر میں اس کی جان جانے کا قوی اندیشہ نہ ہو اور والدین کے پاس ان کے اخراجات موجود ہوں، والدین کی ممانعت کے باوجود وہ سفر کرسکتا ہے ایسے ہی حکم سفر تجارت کا بھی ہے، وکذا الجواب فیما اذا خرج للتفقہ الی بلدۃ اخریٰ ان کان لایخاف علیہ الہلاک بسبب ہذا الخروج کان بمنزلۃ السفر للتجارۃ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۶۵)

اس میں شبہ نہیں کہ رسولؐ نے حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدیں، اسلئے کہ حضرت عمرؓ اس بہو کو ناپسند کرتے تھے، لیکن اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جبکہ اکثر اپنی جہالت کی وجہ سے کسی معقول وجہ کے بغیر اپنے بچوں سے بہو کو طلاق دینے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، ان کو اس حکم میں نہیں رکھا جاسکتا، حضرت عمرؓ کے عدل وفراست کے تحت اور خود رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں "الحق یجری علی لسان عمر" یہ بات نہیں سوچی جاسکتی کہ انہوں نے کسی سبب شرعی کے بغیر اپنے صاحبزادہ سے طلاق کا مطالبہ کیا ہوگا۔ دوسرے اس بات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت کے معاشرہ میں مطلقہ عورتوں کا مسئلہ اس طرح پیچیدہ نہیں تھا جیسا کہ ہمارے معاشرہ میں ہے، بلکہ قرآن کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ کی عدت بھی نہ گزرنے پاتی تھی اور لوگ پیام نکاح دینا شروع کردیتے تھے۔

صورت مسئولہ میں جبکہ بیوی کی ماں بدزبان ہے اور خواہ بیوی اپنی ذات کے لحاظ سے ناشزہ اور نافرمان نہیں ہے، نہ باپ کے لئے درست ہے کہ وہ بیٹے سے طلاق کا مطالبہ کرے، اور نہ بیٹے کے لئے جائز ہے کہ وہ ضرورت شرعی کے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے۔

"ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب"

بینک اور کریڈٹ کارڈ سے متعلق کچھ سوالات

(۱) "جدید فقہی مسائل جلد اول" کے صفحہ ۲۶۵-۲۶۶ پر جناب والا نے گو بینک میں رقم رکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے لیکن کیا واقعی ضرورت کی بنا پر اس کی اجازت دے دی ہے، اس

کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ "بینک میں روپیہ جمع کرنے کے بعد مخصوص تناسب سے اس پر جو نفع ملتا ہے وہ سود ہے" (صفحہ ۲۶۲) اور اگر یہ سود کی رقم نہ نکالی جائے اور بینک میں چھوڑ دی جائے تو یہ ایک سودی ادارے کا مزید تعاون ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اس رقم کو نکال لینا چاہیئے البتہ اپنی ذات میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہیئے (۲۶۳) ــــــــ اس بات سے یہ تأثر ملتا ہے کہ اگر بینک خود سود دے تو اسے ضرور نکال لینا چاہیئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے کرنٹ اکاؤنٹ میں پیسہ رکھا ہوا ہے جس میں اسے سود نہیں مل رہا ہے تو کیا یہ بھی ناجائز کام کے تعاون میں نہ آئے گا ؟ کیا اس صورت میں اس شخص کو کرنٹ اکاؤنٹ کے بجائے سیونگ یا ڈپازٹ اکاؤنٹ رکھ کر اختیاراً سود حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور اسے رفاہ عام کے کاموں میں لگانا چاہیئے ؟

(۲) مغربی ممالک میں بینک کرنٹ اکاؤنٹ میں سود نہ دینے کے باوجود اپنی مختلف خدمات کے لئے کچھ معاوضہ چارج کرتے ہیں، مثلاً فی چیک چارج یا کریڈٹ کارڈ کی سالانہ فیس یا اکاؤنٹ مین اور رقم کی بنیاد پر کوئی سروس چارج وغیرہ وغیرہ ــــــــ براہ کرم یہ بتائیے کہ بینک کو یہ معاوضہ دینے میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں ؟ کیوں کہ اس کی وجہ سے بینک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ یا پھر کرنٹ کے بجائے سیونگ اکاؤنٹ رکھ کر ان چارجز کو سود کی آمدنی سے (OFFSET) کرنا زیادہ مناسب ہوگا ؟ ــــــــــــــــ

(۳) اگر اکاونٹ کا مالک ایک (Minimum Balance) اپنے اکاؤنٹ میں بغیر سود لئے ہر وقت برقرار رکھے تو بینک ان میں سے بیشتر خدمات پر معاوضہ کی چھوٹ دے دیتا ہے ۔ اگر کسی مہینے بیلنس (Minimum) سے نیچے آجائے تو اس مہینے پورے چارجز ادا کرنا ہوتے ہیں ۔ یہ (Minimum Balance) اس بنیاد پر بینک طے کرتا ہے کہ اگر اس رقم پر سود دینا پڑے تو سود کی آمدنی ایک اوسط اکاؤنٹ پر دیئے جانے والی خدمات کے مساوی ہو، اگر ایک شخص کرنٹ اکاؤنٹ تو کھولتا ہے لیکن اس اکاؤنٹ میں (Minimum Balance) برقرار رکھ کر ان خدمات کو مفت حاصل کرتا ہے تو کیا وہ بلاواسطہ سود لیکر ان خدمات کی ادائیگی نہیں کررہا ہے ؟ یا پھر شرعی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے ؟ ۔

(۴) ایک سوال کریڈٹ کارڈ کے ضمن میں ہے ۔ ان ممالک میں جہاں کرنسی کی نقل وحرکت

پر پابندی نہیں، وہاں کریڈٹ کارڈ کا استعمال بہت عام ہے، یہ کارڈ مختلف بینک جاری کرتے ہیں لیکن ان کے حصول کے لئے اکاؤنٹ میں مناسب رقم یا اتنی ہی جائداد (Net-Worth) کا مالک ہونا ضروری ہے، یہ کارڈ اس بات کی ضمانت ہوتے ہیں کہ دنیا میں جہاں بھی اس کارڈ کے ذریعے خریداری کی جائے گی بینک اس کی ادائیگی کرے گا۔ دوکاندار گاہک سے نقد رقم لینے کے بجائے (Charge Slip) پر دستخط کراتا ہے اور پھر اس سلپ کے ذریعے کارڈ جاری کرنے والے بینک سے رقم وصول کرلیتا ہے۔ ادھر بینک ہر ماہ کے اختتام پر کارڈ کے مالک کو ایک بل بھیجتا ہے جس میں مہینے کے دوران کی جانے والی تمام خریداریاں درج ہوتی ہیں، کارڈ کے مالک کو مقررہ تاریخ تک پوری رقم کی ادائیگی کرنا ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا کردے تو کوئی چارج یا سود لاگو نہیں ہوتا لیکن اگر وہ پوری رقم کی ادائیگی میں ناکام رہے تو بینک بقیہ (Un paid) بیلنس پر مارکیٹ کی شرح سے بہت زیادہ شرح پر سود چارج کرنا شروع کردیتا ہے، ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ آخر بینک کو ساری خریداری ایک ماہ کے لئے بغیر کسی منافع کے (Finance) کرنے میں کیا فائدہ ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ بینکوں نے خاصی ریسرچ کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ماہ بہ ماہ پوری ادائیگی کرتے ہیں اور سود سے بچ جاتے ہیں، بیشتر حضرات اپنے ذرائع سے بڑھکر لطف اٹھانے کے قائل ہیں اس لئے مہاجنی سود بھی دینے کو تیار رہتے ہیں

اس کے علاوہ مغربی ممالک میں مالیاتی سسٹم کچھ اس قسم کا ہے کہ اگر کریڈٹ کارڈ نہ ہو تو نہ ہی کار کرائے پر ملتی ہے نہ ہوٹل میں کمرہ ملتا ہے، نہ رات میں آسانی سے پٹرول ملتا ہے (کیوں کہ لوٹ مار کی وجہ سے پٹرول پمپ رات میں نقدی نہیں لیتے) اور نہ ہی مالی نوعیت کا ایسا کوئی کام ہوسکتا ہے جس میں ادائیگی کی ضمانت ضروری ہوتی ہو ——— غرض یہ کہ زندگی بے حد مشکل ہوجاتی ہے ——— اگر کوئی شخص کریڈٹ کارڈ صرف اور صرف ان اغراض اور سہولت کے پیشِ نظر رکھنا چاہے اور نیت کارڈ پر سودی اُدھار لینے کی نہ ہو تو کیا اس کی اجازت ہوگی اور اس صورت میں کارڈ کی سالانہ فیس کیا سود کی رقم سے دی جاسکتی ہے اپنی جیب سے دینے میں وہی قباحت کہ اس سے بنیک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور سودی کاروبا کو ترقی ملتی ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص جس ملک میں رہتا ہے وہاں کے بجائے کسی دوسرے ملک میں پیسہ لگاتا ہے تو اس کی آمدنی پر وہاں کی حکومت غیر مقامی ٹیکس (Non-Resident Tax.) عائد کرتی ہے۔

واضح رہے کہ اس ٹیکس کا کوئی جواز نہیں ہوتا، کیوں کہ سرمایہ کار (Investor) اس حکومت کی فراہم کردہ سہولیات سے غیر مقیم (Non-Resident) ہونے کے ناطے محروم رہتا ہے اس کے علاوہ اس ٹیکس کی شرح مختلف ملکوں کے شہریوں کے لئے مختلف بھی ہوسکتی ہے۔ صفحہ ۲،۳ پر درج شدہ مفتی محمد شفیع صاحب کے فتوے کی روشنی میں اس قسم کا بے جا ٹیکس کیا سود کی رقم سے ادا کرنے کی اجازت نکلتی ہے؟ اگر نکلتی ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ یہ رقم اسی حکومت سے حاصل کی جائے۔ کسی دوسری حکومت یا اپنی حکومت یا کسی بینک سے حاصل کردہ سودی رقم کو اس مد میں استعمال کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

الجواب باللّٰہ التوفیق

ا۔ سود کی رقم مل جانے اور حاصل کرنے کے درمیان بڑا فرق ہے، کرنٹ اکاؤنٹ میں سود حاصل کرنا مقصود نہیں، جب کہ ڈپازٹ اکاؤنٹ میں اختیاراً سود حاصل کیا جاتا ہے، فقہاء نے اصول قائم کیا ہے "الامور بمقاصدہا" کہ کسی عمل پر اس کے مقصود اور عامل کے منشا کے لحاظ سے حکم کا ترتب ہوتا ہے، فتاوی قاضی خاں میں لکھا ہے کہ شراب بنانے والوں سے انگور کا رس فروخت کرنا حرام ہے، اگر ارادہ شراب سازی میں مدد کرنا ہو، اور اگر محض تجارت مقصود ہو تو حلال ہے، "ان بیع العصیر ممن یتخذہ خمراً ان قصدہ بہ التجارۃ فلا یحرم وان قصد بہ لاجل التخمیر حرم وکذا غرس الکرم علی ہذا") پس چوں کہ ڈپازٹ اکاؤنٹ کی صورت میں سود کا لینا مقصود ہے، اس لئے یہ صورت جائز نہ ہوگی ——— پھر حسن نیت کی وجہ سے وہ چیزیں درست ہوتی ہیں جو بذات خود مباح ہوں، جو کام بذات خود معصیت ہو، صرف بہتر نیت اور ارادہ کی وجہ سے حلال و جائز نہیں ہوسکتا، سود لینا کبائر میں سے ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم رشتہ دار سے زنا کرنے سے بھی بڑھ کر ہے، اس لئے رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی نیت سے جائز نہیں ہوسکتا۔

۲ ــــــ اس چارج کی حیثیت میرے خیال میں رقم کی حفاظت وصیانت کی اجرت اور اس کے انتظام وانصرام پر آنے والے اخراجات کی تکمیل کی ہے اس لئے اس کے ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳ ــــــ اس صورت کو ناجائز تو نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ یہ صرف مفت خدمات حاصل کر رہا ہے، سود نہیں لے رہا ہے، البتہ چوں کہ فی الجملہ اس میں قرض پر چارج نہ ادا کرنے کا نفع حاصل کیا جارہا ہے، اس لئے کہ وہ اس زرِ قرض کی وجہ سے ہی اجرت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، اس لئے یہ صورت کراہت سے خالی بھی نہ ہوگی، فقہاء نے "سفتجہ" کو مکروہ قرار دیا ہے، یہ ہے کہ صاحبِ زر کسی کو ایک رقم بطور قرض دے تاکہ وہ کسی خاص مقام پر اس کو محفوظ شکل میں لوٹا دے، پس چوں کہ یہاں قرض پر حفاظت وصیانت کا نفع حاصل کیا جارہا ہے، اس لئے فقہاء اس سے منع کرتے ہیں، عالمگیری میں ہے: وکرہ السفاتج وہو قرض استناد بہ المقرض سقوط خطر الطریق. (ج ۳ ص ۲۹۴) ــــــ

۴ ــــــ کریڈٹ کارڈ کے سلسلہ میں آپ نے جو تفصیل لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصود سودی لین دین نہیں ہے، البتہ امکانی طور پر یہ سود کا ذریعہ بن سکتا ہے، اس لئے اگر کوئی صرف سہولت کے لئے کارڈ رکھے اور نیت رکھے کہ سودی خرید وفروخت سے پرہیز کرے گا تو اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ــــــ دوسرے آپ کی تحریر کردہ تفصیلات کے مطابق مغربی ممالک میں یہ ایک ناگزیر چیز بن کر رہ گئی ہے کہ اس کے بغیر سخت مشقت و دشواری کا سامنا ہے، ایسی چیزوں کو فقہ کی اصطلاح میں "حاجت" کہتے ہیں" والحاجۃ کالجائع الذی لو لم یجد ما یاکلہ لم یہلک غیر انہ یکون فی جہد ومشقۃ۔ (حموی عن الاشباہ ص ۱۲۲) اور اگر کوئی چیز اس قدر ضروری ہو جائے کہ اس سے بالکل چارہ نہ رہے تو اس کو "ضرورت" کہتے ہیں، ضرورت کے بارے میں اصول ہے کہ اس کی وجہ سے ناجائز چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں" الضرورات تبیح المحذورات" پھر حاجت بھی کبھی کبھی "ضرورت کے حکم میں ہو جاتی ہے، ابن نجیم مصری لکھتے ہیں: الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ کانت اوخاصۃ (الاشباہ ص ۹۱) اس لئے اگر کارڈ گیرندوں کو کچھ سود ادا کرنا ہوتا تو بھی میرا خیال ہے کہ یہ صورت جائز ہوتی۔

۵ ــــــ "غیر مقامی ٹیکس" کا معاملہ اس پر موقوف ہے کہ اس ٹیکس کی بنیاد اور

مقصود کیا ہے؟ اگر واقعی اس ٹیکس کے لئے کوئی معقول وجہ نہ ہو تو سود کی ٹیکس میں ادائیگی درست ہوگی خواہ یہ رقم اسی حکومت سے حاصل شدہ ہو یا کسی اور حکومت سے۔"

"ہذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب"

مباہلہ کا شرعی حکم

سوال ــــــــ مباہلہ کی تعریف کیا ہے؟ کن صورتوں میں کی جاتی ہے، اس کی شرطیں کیا ہیں؟ اور امت مرحومہ کے افراد باہم مباہلہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔

الجواب ــــــــ مباہلہ کے اصل معنی دو آدمیوں کا خدا کے حضور گریہ وزاری کرنا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں مباہلہ یہ ہے کہ دو فریق گریہ وزاری کے ساتھ خدا کے حضور دعا کریں کہ ہم میں سے جو باطل ہو اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو تاکہ حق واضح ہو جائے، حضورؐ نے خود مباہلہ فرمایا ہے، چنانچہ جب حضرت مسیح کے بارے میں وفد بنو نجران سے آپؐ کی گفتگو ہوئی اور وہ دلائل پیش کئے جانے کے باوجود اپنی ضد پر قائم رہے تو آپؐ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی، جس کی طرف خود قرآن مجید میں آل عمران میں اشارہ موجود ہے۔ (الدر المنثور ج ۲ ص ۲۳۲)

اب سوال یہ ہے کہ انبیاء کرام کے بعد بھی مباہلہ کا حکم باقی ہے یا نہیں؟ تو بعض حضرات کے نزدیک اب بھی مباہلہ کا حکم باقی ہے، جیسا کہ شامی نے صاحب "غایۃ البیان" سے نقل کیا ہے۔

(احکام القرآن للعثمانی ج ۲ ص ۲۴)

ماضی قریب کے اہل علم میں حضرت تھانویؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے لیکن اکثر سلفِ صالحین کا مسلک ہے کہ اب یہ حکم باقی نہیں ہے، یہ صرف انبیاء کے لئے تھا، کیوں کہ انبیاء کا عمل "وحی" اور الہام خداوندی کی بنیاد پر ہوا کرتا تھا اور اس طرح حق واضح ہو سکتا تھا، اب اگر مباہلہ کیا جائے تو ضرور نہیں کہ "اہل باطل" پر عذاب آ ہی جائے اور ظاہر ہے جب عذاب ہی نہیں آئے گا تو حق کی صداقت واضح نہ ہو سکے گی اور یہ ایک بے مقصد کام ہوگا۔ راقم الحروف کا بھی یہی خیال ہے کہ اب حق کے مخالفین کے لئے یا تو موعظت و تذکیر ہے یا استدلال اور بحث و مناظرہ، جو لوگ مباہلہ کے قائل ہیں وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا عمل پیش کرتے ہیں مگر عین ممکن ہے کہ یہ ان کی

ذاتی رائے ہو، اس لئے صحابہ کے درمیان ہونے والے شدید اختلافات کے باوجود غالباً کسی اور صحابی سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، دوسری دلیل "لعان" ہے کہ اگر شوہر بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو ایک دوسرے پر لعنت کرانے کے بعد دونوں کو علیحدہ کرا دیا جاتا ہے، اسی سے حضرت تھانویؒ نے بھی استدلال کیا ہے مگر یہ دلیل بھی محل نظر ہے اس لئے کہ لعان پر دنیا میں ایک حکم زن و شو... کی علیحدگی کا مرتب ہوتا ہے۔ جب کہ مباہلہ کی وجہ سے کوئی حکم مرتب کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لعان کی وجہ سے حدود شرعیہ کی تکمیل اور تنفیذ کرائی جاتی ہے اس لئے کہ وہ عورت کے حق میں زنا کی سزا اور شوہر کے حق میں قذف کی سزا کے درجہ میں ہے جب کہ مباہلہ میں یہ بات نہیں پائی جاتی، جو لوگ مباہلہ کے قائل ہیں ان کی حیثیت سے مشہور مفسر شہاب الدین آلوسی نے صرف فرقہ ناصبہ کا ذکر کیا ہے۔

وذہب النواصب الی ان المباہلۃ جائزۃ لاظہار الحق الی الیوم الا انہ یمنع فیہا ان یحضر الاولاد والنساء۔

(روح المعانی ج ۳ ص ۱۹۰)

پھر یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ جو لوگ مباہلہ کے قائل ہیں ان کے یہاں بھی مباہلہ شرعی اور یقینی امور میں ہے، ظنی، اجتہادی اور غیر شرعی مسائل میں مباہلہ نہیں ہے، نیز وہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں کہ اپنی عورتوں کو اور بچوں کو ساتھ لے کر ایک دوسرے پر لعنت کرنے کو جمع ہوں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مباہلہ کا جو طریقہ منقول ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے دعا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ مونڈھوں تک اٹھائے تھے۔

گو یا جن حضرات کے یہاں مباہلہ درست ہے ان کے نزدیک بھی صرف راہ صواب سے منحرف کے حق میں بد دعا کرنے کی گنجائش ہے ●●

"ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب"۔

تعارف و تبصرہ

مولانا سرفراز احمد قاسمی

سہ ماہی "بحث ونظر" پٹنہ

یہ رسالہ بہار کے مردم خیز اور علم بیز خطہ "پھلواری شریف، پٹنہ" سے نکلا ہے، ابھی اس کے دو ۲ ہی شمارے نکلے ہیں، رسالہ کے علمی معیار کیلئے یہ ذکر کر دینا کافی ہے کہ ملک کے مشہور صاحب علم فقیہ العصر حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی اس کے مدیر ہیں۔ رسالہ اس لحاظ سے برصغیر میں اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے کہ اس کا موضوع خالصۃً "فقہ" ہے۔ ہر شمارہ میں چند اہم مسائل پر فتاویٰ، کسی ایک اہم مقدمہ کے فیصلہ کا خلاصہ، کسی مشہور فقیہ کا تذکرہ اور کسی اہم دینی کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے لیکن ان سب سے اہم سلسلہ کسی ایک جدید فقہی مسئلہ پر تحریری مذاکرہ وسمینار ہے جس میں ایک مفصل سوالنامہ پر مختلف اہل علم کے جوابات نقل کئے جاتے ہیں اور اخیر میں خود مدیر محترم کا محاکمہ ہوتا ہے، جو ان کی غیر معمولی فقہی دراست کا شاہکار اور آئینہ ہوتا ہے۔

واقعہ ہے کہ ہر صاحب علم کیلئے یہ رسالہ متاع بے بہا ہے اور اس علمی انحطاط کے دور میں جن لوگوں نے اس طرح کے خالص علمی اور فقہی رسالہ کا اجرا کیا ہے وہ ہر طرح حوصلہ افزائی کے حقدار ہیں۔

ضخامت ۹۶ صفحات ہے، زر سالانہ ۴۰ روپئے، کتابت وطباعت عمدہ اور دیدہ زیب۔

مراسلت کا پتہ

بحث ونظر، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

عصر حاضر کے فقہی مسائل

مصنف ——— مولانا بدر الحسن قاسمی

صفحات :- ۱۲۰ ——— قیمت :- ۱۰ روپئے۔

طباعت :- فوٹو آفسٹ، ٹائیٹل خوشنما و دیدہ زیب ——— ناشر :- مرکز دعوت وتحقیق اسلامی، حیدرآباد۔

اہلِ نظر سے یہ امر مخفی نہیں کہ عصر حاضر نے بہت سے نئے فقہی مسائل پیدا کر دیئے ہیں یہ مسائل زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی تعداد بھی خاصی ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے حل کے لئے فقہ کے وسیع ذخیرہ پر گہری نظر، شریعت کے روح سے آگہی اور زمانہ کے تقاضوں سے واقفیت، نیز زیر بحث مسائل کے پسِ منظر سے باخبر ہونا ضروری ہے، اسی نزاکت و اہمیت کی وجہ سے اس طرف کم لوگوں نے توجہ کی ہے، اور جن لوگوں نے کی ہے ان میں بھی ان منصف مزاج اہل قلم کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے افراط و تفریط سے خود کو بچایا ہو اور دامنِ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ہو۔

لیکن ایسی ہی چند اہم تحریروں میں ایک زیرِ نظر "کتاب" بھی ہے۔ کتاب میں کل بارہ مسائل پر بحث کی گئی ہے، یہ مسائل ہیں: غیر معتدل علاقوں میں نماز و روزہ کا مسئلہ، کمپنیوں کے شیرز اور باونڈز پر زکوٰۃ، حق تصنیف کی خرید و فروخت، انسانی زندگی کا آغاز کب سمجھا جائے؟، موت کا اطلاق کب ہوگا؟ مصنوعی حمل و تولید، رحم کے جذبہ سے قتل، پوسٹ مارٹم، اعضاء کی پیوند کاری، انسانی دودھ کا بینک، الکوہل کا شرعی حکم اور مستعار بالوں کا استعمال؛ —— یوں تو ان میں سے اکثر مسائل پر مختلف اہل علم نے برصغیر میں اس سے پہلے بھی قلم اٹھایا ہے، تاہم اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ فقہی بحث کے ساتھ ساتھ زیر بحث مسائل کی تفصیلات اور سماجی تناظر کو بھی واضح کیا گیا ہے جس سے ان کی صحیح نوعیت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، نیز انسانی زندگی کا آغاز کب ہوگا؟ اور "موت کا اطلاق کس پر ہوگا؟ دماغی خلیوں کے بے جان ہونے پر یا قلب کے اپنا عمل چھوڑ دینے پر؟ یہ دو مسائل ایسے ہیں کہ شاید اردو زبان میں اب تک اس پر کوئی قابلِ ذکر تحریر سامنے نہیں آئی ہے۔

مصنف نے مُردہ انسانوں سے "اعضاء کی پیوند کاری" کو درست قرار دیا ہے اور اس کی فقہی نظیریں بھی ذکر کی ہیں جو ہمارے ارباب افتاء کے لئے خصوصیت سے قابل توجہ ہے اور ضرورت ہے کہ وہ اس مسئلہ میں توسع اور یسر کی راہ اختیار کریں۔ —— کتاب عوام و خواص کیلئے یکساں مفید ہے، زبان عام فہم اور سہل ہے۔ کتاب درج ذیل پتوں سے حاصل کی جاسکتی ہے:

★ دار العلوم سبیل السلام، بالا پور، حیدرآباد ۵۔ ★ —— مسجد عامرہ، عابد روڈ، حیدرآباد ۱۔
★ اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چار مینار، حیدرآباد۔ ★ —— ندوہ ایجنسی، ارم کالج، اعظم پورہ، حیدرآباد

"صفا" کی ڈاک

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ "صفا" نے نہایت مختصر مدت میں عوام بالخصوص اہل علم و تحقیق کے حلقہ میں مقبولیت حاصل کر لی ہے، اس سلسلے میں کافی خطوط دفتر کو موصول ہو رہے ہیں، ہم ذیل میں آئے ہوئے بعض خطوط کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں، ادارہ تمام مکتوب نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے احساسات سے واقف کرایا جو اس کے لئے تقویت کا باعث ہیں۔ (ادارہ)

عزیزی مکرمی! سلمہ اللہ تعالیٰ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں کچھ دنوں پہلے اپنے بڑے فرزند سید محمود احمد بختیاری کے ساتھ ہندوستان کے بعض بڑے شہروں کا دورہ کرتے ہوئے دبئی، شارجہ اور ابوظبی وغیرہ پہونچا، یہاں کے علماء سے پرلطف ملاقاتیں رہیں معہد احسانی کا بھی تعارف ہوا، جسے عام طور پر خواص نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، ان ریاستوں کے سفر میں یہ معلوم کر کے بھی خوشی ہوئی کہ آپ یہاں آئے تھے، اور آپ کی دعوتی مہم جاری رہی جس کے نقوش و اثرات میں نے وہاں دیکھے۔

یہ خط میں آپ کو مدراس سے لکھ رہا ہوں جس کا محرک آپ کا رسالہ "صفا" ہے جو ایک جگہ نظر آیا اس وقت میرے سامنے دوسرا شمارہ ہے، ماشاء اللہ بہت خوب ہے، اسے جاری رکھئے اور خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کیجئے ——————

مولانا سید شاہ **صبغۃ اللہ** بختیاری
معہد احسانی، دارالارشاد، رائے چوٹی، کڑپہ۔

عزیز گرامی! دعائیں۔

آپ نے مجھے یاد رکھا، جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ "صفا" کے دو شمارے محض فضلِ الٰہی سے مجھ تک پہنچ گئے دیکھا پڑھا، حُسنِ ظاہری کے ساتھ مطالب و معانی کی بلندی سے جی خوش ہوا، وقت کی اہم ضرورت تھی، ہر خواص و عوام میں ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگا، آپ کی محنت حسنہ ٹھکانے لگے گی، عزیزی خالد سیف اللہ اور دوسرے عزیزوں کو دعائیں، ——— دعاگو

مولانا حکیم **محمد زماں** حسینی، کلکتہ۔

محترم و مکرم! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

رب تعالیٰ سے قوی امید کہ بعافیت ہوں گے۔

"صفا" اور "صوت السّلام" کے تازہ شمارے موصول ہوئے، اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے جہاں چیدہ چیدہ علماء کرام کے اعلیٰ مضامین شائع فرمائے، وہیں احقر کا ایک مضمون بھی عربی میں منتقل فرما کر مجھے مشکور فرمایا، آپ نے عربی میں جس طرح ترجمانی فرمائی ہے، قابلِ احترام اور لائقِ تحسین ہے میری طرف سے تہہِ دل سے مبارکباد قبول فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں سے ان دونوں رسالوں کے ذریعہ علم و تحقیق اور دین و ملت کی تا دیر حسن و خوبی کے ساتھ خدمت لیتا رہے ——— والسّلام

مفسرِ قرآن مولانا **عبد الکریم** پاریکھ، ناگپور

(خازن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

برادرِ مخلص! زادکم اللہ فقہاً وبارک فی جہودکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا عنایت نامہ ملا، آپ کو خدا نے علم و تحقیق کے میدان میں کام کی جو توفیق دے رکھی ہے اس کے بعد "صفا" اور "صوت السّلام" کیلئے کسی اور لکھنے والے کی ضرورت یہ بات میرے نزدیک "بحث و نظر" کی محتاج ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو صحیح میدان عمل کے انتخاب اور پھر کام کی

قوت اور توفیق دی، آپ ہم جیسے کاہلوں کی طرف سے کفارہ ہیں، خدا سے دعا ہے کہ وہ مزید توفیق دے اور قبولیت بخشے۔

میرا شمار پہلے بھی اہل علم کی صف میں نہیں تھا اور اب تو اور بھی علم کے روایتی اور "مسنون" مراکز سے دور ہوں، اس لئے کچھ بھیجتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے —— لکھے ہوئے مضامین کا تو واقعی بڑا طومار جمع ہوگیا ہے لیکن وہ سب رواروی میں لکھے ہوئے اور اسی طرح کے ہیں جن کا نمونہ آپ نے "جدید فقہی مسائل" کے مضامین کی شکل میں دیکھا ہے، تاہم ارسال کردوں گا تاکہ آپ لوگوں کے ذریعہ ان پر نظر ثانی ہوجائے اور پھر کبھی ان کی تکمیل کی توفیق ہوجائے۔

"صفا" ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے قابل مبارکباد اور آپ حضرات کی محنت، لیاقت اور خوش ذوقی کا آئینہ دار ہے اور یہ امید ہے کہ مستقبل میں اس کی اہمیت اور ضرورت محسوس کی جائیگی میری تمنا تو یہ ہوگی کہ آئندہ حالات سازگار ہوں تو اسے ماہنامہ کردیا جائے، خالص علمی اور تحقیقی مضامین کے ساتھ فکری، اصلاحی اور دعوتی قسم کے مضامین کا بھی اس میں ایک خانہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات کی کوششوں کو دیکھ کر یہ امید ہوچلی ہے کہ عزم و ہمت ہو تو بہت کچھ کیا جاسکتا ہے اور "پان" "قیلولہ" اور "گاؤ تکیہ" سے وابستہ گروہ کا جمود توڑنے کی راہ بھی یہی ہے کہ کام کا عملی نمونہ سامنے آئے —— والسلام

مولانا بدر الحسن القاسمی (مقیم کویت)

مکرمی و محترمی!

سلام مسنون،

مولوی عبدالمجیب حیدرآبادی کے بدست "صفا" اور "صوت السلام" کے دو شمارے موصول ہوئے۔ مولانا بدر الحسن صاحب کی تالیف "عصر حاضر کے فقہی مسائل" بھی ملی، عنایت کا بہت بہت شکریہ،

آپ کی اس عنایت سے دو طرح سے خوش ہوں، ایک تو یہی کہ ابتک میں ان رسالوں سے محروم تھا، دوسری یہ کہ آپ نے مجھے کسی بہانے سے یاد تو کیا۔ آپ کے یہ دونوں رسالے میں نے پڑھے، بعض مضامین مکمل طور پر اور بعض سرسری مگر ختم ایک دن ہی میں کیا، دونوں رسالے بہت پسند آئے، مبارکباد قبول فرمائیں —— اردو رسالہ "صفا" بے حد خوبصورت اور وقیع ہے، عربی

رسالے کے بارے میں کم وبیش یہی تبصرہ ہو سکتا ہے، یہ عربی آپ کی بہت اچھی کوشش ہے اور آپ کے رفقاء کی محنت کا آئینہ دار ہے، البتہ اس میں بعض غلطیاں بھی ہیں، اس کی پروف ریڈنگ کیلئے متعین فرد کو اس کی تاکید کر دیں، ویسے بعض غلطیوں سے مفر ممکن نہیں۔ مجھے "الداعی" اور اس کے بعد "الثقافہ" میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔

یہ اچھا ہوا کہ آپ نے ابھی رسالوں کو سہ ماہی کی صورت میں شائع کیا ہے، ضرورت پڑنے پر "صفا" کو ماہنامہ کر دیں مگر "صوت السّلام" کو اسی حال میں رہنے دیں، عربی رسالہ ماہنامہ کی صورت میں وقت اور افراد کا متقاضی ہے، استقلال اور استمرار کیلئے سہ ماہی ہی مناسب ہے، خدا کرے حالات اتنے موافق ہو جائیں کہ ہر ماہ نکالنے میں بھی دشواری نہ ہو، اللہ تعالیٰ دونوں رسالوں کو مقبول ومعروف بنائے۔ آمین ———— مولانا بدرالحسن صاحب کی کتاب آپ نے پہلے بھی عنایت فرمائی تھی جو مجھے مل گئی تھی، دوسرے نسخے کو مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کے پاس بھیجدوں گا، وہ آپ سے اور مولانا بدر صاحب سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ بذات خود اچھے صاحب علم ہیں اور اس طرح کی چیزوں کی بڑی قدر فرماتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا بدر صاحب کی یہ کتاب ظاہری اور معنوی اعتبار سے بہت خوب ہے، نئے مسائل پر نئے انداز سے انہوں نے قلم ضرور اٹھایا ہے اور ساتھ ہی اسلاف واکابر کی رائے کو بھی اہمیت دی ہے جو ان کی سلامت علمی کی علامت ہے۔ خدا کرے کہ وہ اپنی فکری اور فقہی تحقیقات کو شائع کر کے عوام وخواص کو استفادے کا موقع دیں۔

والسّلام

مولانا محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث دار العلوم (وقف) دیوبند

و مدیر "الثقافہ"

مکرّمی! السّلام علیکم

"صفا" سے سعی کا آغاز مبارک ہو، جس جذبہ وخلوص نے اس علمی خدمت کے لئے مجبور کیا وہ بھی لائق تحسین ہے، پہلے شمارہ کے بعض مضامین کا تفصیلی اور بعض کے اجمالی مطالعہ کا موقع ملا، محسوس

یوں ہوا کہ "برہان" اور "معارف" نے برسوں کے بعد جس مقام کو حاصل کیا اور جن تحقیقی مضامین کی اشاعت کے ذریعہ اسلامی و ملی خدمت انجام دی "صفا" بھی اس صف میں بہت جلد شامل ہوسکتا ہے۔

عرصہ سے دلی خواہش تھی کہ ایسا کوئی معیاری پرچہ شائع ہو جو نہ صرف زبان و بیان کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا کہلایا جائے بلکہ علمی و تحقیقی اتھارٹی کا درجہ رکھنے والا اسلامی آرگن ہو جو اہل علم کی پیاس بجھائے اوسط علم رکھنے والوں کو معیار کی طرف راغب کرے اور عامۂ مسلمین کو اپنی قابلیت و علمیت میں اضافہ کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بنے ———— بحمداللہ "صفا" کا انداز کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ "صفا" کے مضامین اور اس کی صاف کتابت و طباعت، صفائی پسند طبیعت کے لئے پسندیدہ ہوگی۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل ۲۳ رسطر فی صفحہ اور اوسطاً سترہ الفاظ فی صفحہ کے لحاظ سے اکتیس ہزار دو سو اسی ۳۱۲۸۰ الفاظ پر مشتمل یہ خوشنما رسالہ دیدہ زیب ہونے کے علاوہ مضامین کی عمدگی کے لحاظ سے بھی اپنا ایک مقام خاص رکھتا ہے۔

کچھ بھی کہیئے مگر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا قلم، انداز تحریر اور ندرت بیان لائق تحسین ہے، اللہ تعالیٰ نے جس صلاحیت کے وافر حصّہ سے نوازا ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے، ؎ اللہ کرے ہو حسنِ قلم اور زیادہ،

مجھے قوی امید ہے کہ یہ سہ ماہی رسالہ اسی آب و تاب کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا رہے گا اور عالم کو منور کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

پر خلوص گذارش بھی ہے کہ اس کو اسلام کا نقیب، ملّت کا آرگن بنانے کی مقدور بھر کوشش کیجئے، جدید حالات، کشمکش عقائد اور فروعی اختلافات سے بچایئے، کسی ایک مکتب فکر کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بننے سے روکیئے، افراط و تفریط سے احتراز بہرحال ضروری ہے، اُمت انتشار کے آخری دہانے پر کھڑی ہے، خدارا اس کو سنبھالئے اور قعر مذلت میں گرنے سے قبل قلم کی جولانی کے ذریعہ سنبھالئے۔

اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں اور جوش عمل میں ہوش کے دامن سے ہر لمحہ وابستہ رکھیں، آمین بحقِ طٰہٰ و یٰسین، ————

دعاگو

قاری جمال محمد طاہر

فلک نما، حیدرآباد۔

مکرمی!
تسلیم،

رسالہ صفا سہ ماہی کے اول، دوم شمارے (اپریل ــــ اکتوبر ۸۸ء) لائبریری کو موصول ہوئے، اس عنایت کا شکریہ، ــــ "صفا" کے علمی و ادبی اور دینی مضامین بڑے معیاری، مفید اور لائق تحسین ہیں، کتابت اور طباعت بھی دیدہ زیب ہے، خدا کرے "صفا" کا معیار نگارش اور بھی بلند و بالا ہو، ــــ امید ہیکہ آئندہ بھی اپنی گرانقدر نوازشات سے لائبریری کے قارئین کو مستفید فرماتے رہیں گے، لائبریری اور قارئین آپکے شکرگذار ہوں گے، ــــ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو،

آپکا ــــ **جاوید**

انچارج شعبۂ رسائل، خدابخش لائبریری، پٹنہ

برادرِ عزیز!
السّلام علیکم،

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

علم ہوا کہ آپکے ادارہ سے عربی پرچہ "صوت السّلام" اور اُردو پرچہ "صفا" شائع ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے کا اشتیاق ہے، براہ کرم اس کے سارے پرچے بھیجدیں، عنایت ہوگی، امید ہے کہ "الرشاد" برابر مل رہا ہوگا، ــــ فقط

خادِم

مولانا **مجیب اللہ** ندوی، ناظم جامعۃ الرشاد و مدیر "الرشاد"

مکرمی و محترمی!
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا،

کافی عرصہ سے سوچتا رہا کہ خط لکھوں لیکن اپنی سستی پر نادم ہوں، آپ کے ارسال کردہ دونوں عربی اور اُردو رسالے موصول ہوئے، میں نے اسے از اوّل تا آخر بغور دیکھا، بہت پسند کیا، خدا آپ حضرات کی کوششوں کو مقبول فرمائے، دونوں رسالے ظاہری اور معنوی شوکت کے اعتبار سے ملک کے ممتاز رسالوں میں اپنا مقام رکھتے ہیں، خدا کرے یہ رسالہ تسلسل کے ساتھ نکلتا رہے تاکہ قوم و ملّت کی بہترین خدمت انجام دے سکے۔

مخلص

مولانا محمد **حنیف** ملّی (شیخ الحدیث معہد ملت، مالیگاؤں)

خبرنامہ دارالعلوم سبیل السلام

مولانا محمد یوسف مفتاحی

• مورخہ ۴ ذوقعدہ ۱۴۰۸ھ روز یکشنبہ کو صبح ۹ بجے بخاری شریف اور دورۂ حدیث کے افتتاح کے ضمن میں ایک عظیم الشان تقریب منعقد ہوئی، جس میں حضرت مولانا ابوالسعود صاحب امیر شریعت کرناٹک و نائب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ۔ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری، شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند۔ حضرت مولانا عبدالحنان صاحب استاذ حدیث دارالعلوم ماٹل والا گجرات، حضرت مولانا مفتی محمد اشرف علی شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور۔ حضرت مولانا معین الدین قاسمی مدرسہ سراج العلوم نانڈیڑ کے علاوہ حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی، امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش، و مہتمم دارالعلوم حیدرآباد۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب، ناظم مجلس علمیہ آندھرا پردیش، و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم حیدرآباد۔ مولانا سید اکبر الدین صاحب قاسمی ناظم مدرسہ ریاض الاسلام و نائب ناظم مجلس علمیہ، مولانا امیر اللہ خاں صاحب ناظم مدرسہ سراج العلوم محبوب نگر۔ مولانا عزیز الدین قاسمی، مولانا احسان الدین صاحب ناظم و صدر مدرس دارالعلوم نلگنڈہ، مفتی امان اللہ قاسمی مدرسہ مدینۃ العلوم ریال گوڑہ، مولانا عبدالقادر صاحب مفتاحی، ناظم مدرسہ مدینۃ العلوم کوواڑ، مولانا قطب الدین علی چشتی مہتمم انوار الہدیٰ، مولانا غلام محمود قاسمی مدرسہ منہاج العلوم میدک، مولانا قاضی سمیع الدین صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم نرساپور، مولانا نجم الحسن صاحب قاسمی اور شہر حیدرآباد اور ریاست کے اکثر دینی مدارس کے نمائندے شریک تھے۔ نیز محترم جناب نعیم اللہ خاں صاحب امیر جماعت تبلیغ حلقہ آندھرا پردیش بھی اپنے بعض رفقاء کے ساتھ تشریف لائے، اور خطاب فرمایا،

اس موقع سے جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس نے مدرسہ کا تعارف کرایا، حضرت ناظم صاحب نے مطبوعہ خطبۂ استقبالیہ پڑھا، حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری نے بخاری شریف کی پہلی حدیث پر مفصل اور ایسی دلنشیں تقریر فرمائی کہ پورا مجمع ہمہ تن گوش تھا۔ بیرونی مہمانوں میں حضرت مولانا عبدالحنان صاحب، مفتی محمد اشرف علی صاحب اور مولانا معین الدین قاسمی نے بھی خطاب فرمایا۔ صدارتی خطبہ حضرت مولانا ابوالسعود صاحب نے دیا۔ اخیر میں جناب الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب صدر مجلس انتظامی نے شکریہ ادا کیا۔ اندازہ ہے کہ حاضرین کی

تعداد دو ہزار سے متجاوز تھی ــــــــ یہ اجلاس ۲ بجے دن تک چلتا رہا، اس کے بعد انہیں اکابر علماء کے ہاتھوں مدرسہ کی لائبریری کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس کا کام بحمد اللہ شروع ہو چکا ہے۔

• طلبہ کے اردو عربی تحریری و تقریری پروگرام کا افتتاحی اجلاس حضرت ناظم صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس میں طلبہ نے اردو میں اور عربی میں تقریریں کیں اور مقالات پڑھے، طلبہ نے اس اجلاس کے لئے ہال کو بڑی عمدگی سے آراستہ کیا تھا اور اس موقع سے نہایت عمدہ اور مؤثر پروگرام پیش کیا ــــــ اخیر میں جناب مولانا برکت اللہ صاحب قاسمی، مولانا افضل الرحمٰن صاحب قاسمی اور صدر مدرس صاحب نے بیش قیمت نصیحتیں فرمائیں، حضرت ناظم صاحب نے اپنے خطاب میں صدر مدرس صاحب کے التماس پر طلباء کی لائبریری کے لئے ۵ ہزار روپے کی کتب فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زبیر احمد صاحب کی دعا پر یہ پر اثر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

اس کے بعد سے بحمد اللہ ہر جمعرات کو بعد نماز ظہر تقریری پروگرام اور پندرہ دنوں میں ایک ایک بار بعد نماز مغرب عربی تقریروں اور اردو مقالات کا پروگرام منعقد ہو رہا ہے۔

• حفظانِ صحت کی رعایت کرتے ہوئے مدرسہ میں پہلے سے طلباء کے کھیل کود کا نظم ہے، چنانچہ اس سال بھی طلبہ کی مختلف ٹیمیں بنادی گئی ہیں، جو فٹ بال وغیرہ کھیلتی ہیں، امسال حفاظتِ خود اختیاری کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے "کراٹے" سکھانے کا بھی نظم کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کا افتتاح ماہ ذیقعدہ سے عمل میں لایا گیا ہے۔ افتتاحی موقع سے کراٹے ماسٹر حافظ جاوید صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہایت مؤثر اور دلچسپ مظاہر پیش کیا، اس افتتاحی تقریب میں تمام اساتذہ و طلباء موجود تھے، اخیر میں جناب صدر مدرس صاحب نے مختصر خطاب فرمایا تقریباً نئو طلبہ اس تربیت سے مستفید ہو رہے ہیں اور ہفتہ میں تین دنوں عصر تا مغرب کلاسس ہوتے ہیں۔

• مشکوٰۃ شریف کے افتتاح کے سلسلہ میں مدرسہ عائشہ (داراب جنگ کالونی سعید آباد) میں ایک تقریب جناب صدر مدرس صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوئی، حضرت ناظم صاحب نے مشکوٰۃ شریف کا افتتاح فرمایا اور موقع کی مناسبت سے نہایت مؤثر اور دلنشیں خطاب فرمایا۔ مدرسہ کے ناظم مولانا خواجہ نذیر الدین صاحب کے شکریہ پر مجلس ختم ہوئی۔

• مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو پاکستان کے شہید صدر جناب محمد ضیاء الحق مرحوم کے حادثۂ وفات کی اطلاع جونہی ملی اسلام کے لئے شہید مرحوم کی جد وجہد اور مساعی اور لومۃ لائم سے بے پرواہی کی بنا پر دینی حلقہ کو ان سے

جو تعلق خاطر تھا، اس کے تحت اساتذہ وطلبہ کو طبعی طور پر اس سے بہت دکھ ہوا، چنانچہ ظہر کے بعد مدرسہ کی مسجد میں تمام اساتذہ وطلبہ نے اکٹھا ہو کر ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔ اخیر میں جناب صدر مدرس صاحب نے شہید موصوف کے بارے میں تعارفی اور تعزیتی تقریر کی اور شیخ الحدیث صاحب مدظلہ نے دعا فرمائی۔

• مدرسہ دار العلوم اسلامیہ عبدیہ میوات کے معروف عالم وداعی جناب مولانا مفتی عبدالرشید صاحب مورخہ ۲۳ر جون کو مدرسہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور تفصیل سے مدرسہ کو دیکھا، اساتذہ وطلبا سے ملاقات کی، طلبا کو خطاب بھی فرمایا۔ مفتی صاحب نے مدرسہ سے بہت تعلق خاطر کا اظہار فرمایا، مدرسہ کے علمی اور تصنیفی وتالیفی ماحول کو دیکھ کر بہتر تاثر کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس مدرسہ کے متعلقین کی جتنی تحریری خدمات ہیں وہ بڑی بڑی جامعات کو بھی حاصل نہیں ہیں۔

• شہر کے مشہور قائد جناب ابراہیم بن عبداللہ مستقلی ایم، ایل، اے بھی مورخہ ۱۸ر محرم ۱۴۰۹ھ کو مدرسہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور تفصیل سے جاریہ تعمیری کاموں کو بھی دیکھا اور مفید مشورے دئے، افتتاح بخاری شریف کے موقع سے گو لائبریری کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا، لیکن اب تک اس کے تعمیری کام کا عملاً آغاز نہ ہو سکا تھا، چنانچہ موصوف ہی کے ہاتھوں اس کا آغاز عمل میں آیا۔ واضح ہو کہ ایک صاحب خیر نے مدرسہ کا دورہ کیا اور مدرسہ کی کارکردگی سے متاثر ہو کر کتب خانہ کی مکمل تعمیر کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ مدرسہ کے دوسرے تعمیری کام بھی تیزی کے ساتھ جاری ہیں، دار الحدیث کی چھت بھی پڑ چکی ہے اور درس گاہ کے بقیہ حصہ کا کام بھی پوری سرعت کے ساتھ چل رہا ہے۔

• مدرسہ کے عربی ترجمان "صوت السلام" کا دوسرا شمارہ چھپ چکا ہے اور تیسرا شمارہ بھی پریس کے حوالہ ہے، بحمداللہ عرب، اہل علم نے اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے "البلاغ" کویت نے اس پر وقیع تبصرہ کیا ہے، اور الجزائر وغیرہ مختلف عرب ملکوں سے حوصلہ افزا خطوط آئے ہیں —— "صفا" کے ابھی چند ہی شمارے نکلے ہیں، تاہم اللہ کا شکر ہے کہ وہ دینی اور علمی حلقوں میں اپنا مقام بناتا جارہا ہے۔

مدرسہ کے ذمہ داروں اور اساتذہ کی دعوتی اور اصلاحی جد وجہد حسب معمول جاری ہے۔ چنانچہ حضرت ناظم صاحب نے دو علحدہ علحدہ جلسوں میں ارم کالج، اعظم پورہ میں "حج کی اہمیت" اور "شہادت حسینؓ" کے سبق آموز پہلو پر خطاب فرمایا، ہر انگریزی ماہ کے پہلے منگل کو فقہی سوال وجواب (فقہی مذاکرہ) کا سلسلہ بھی جاری ہے، جس میں جناب صدر مدرس صاحب حاضرین کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں (باقی صـ۲۶ پر)

DARUL-ULOOM
SABEELUSSALAM
Sabeel Nagar, Balapur, Behind
Salalah, Barkas, Hyderabad-500 005. A.P.(India)
Phone:239450